معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۵۰ ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۹۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۰

ماہ جولائی ۱۹۹۲ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۵۱ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۲ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افغانستان میں مجاہدین کی فتح و کامرانی اور روس اور اسکی حاشیہ بردار حکومت کی شکست و ناکامی پر ہر انصاف و معقولیت پسند آدمی کو خوش ہونا چاہیے اور جو ممالک اور حکومتیں کمزور قوموں اور ملکوں کی آزادی و خود مختاری کی ہمدردی و حمایت کا دم بھرتی ہیں اور ظلم و استحصال کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کرتی ہیں ان کے لیے تو یہ اور زیادہ خوشی کا موقع تھا لیکن اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی نے انہیں اندھا کر دیا ہے اس لیے مجاہدین کی کامیابی پر انہیں بڑا غم و غصہ ہے، حالانکہ افغانستان میں پسپائی کے بعد روس معمورۂ عالم سے اس طرح غائب ہو گیا ہے کہ کَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا، اشتراکیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے لیکن سرمایہ داری کی لعنت کا ناپید ہونا بھی ضروری ہے تاکہ دنیا امن و سکون کا گہوارہ بن جائے ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ　　دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

بات صرف افغانستان کی نہیں ہے، جمہوریت اور آزادیٔ اقوام کے یہ علمبردار ہر جگہ جمہوریت کشی پر آمادہ ہیں دراصل یہود و نصاریٰ کو دنیا کے کسی خطہ میں بھی اسلام کا بول بالا گوارا نہیں، وہ مسلمانوں پر جو چاہیں ظلم و ستم ڈھائیں مگر انہیں آہ و فریاد کی بھی اجازت نہیں دیتے، تثلیث کے فرزندوں کے معیار اور پیمانے دوہرے ہیں، مسلمانوں کو تنگ کرنا اور ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر دینا یہ اپنا حق سمجھتے ہیں لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ، الجزائر کے انتخاب میں کامیاب گروہ کے بجائے اپنی پسند اور مرضی کے لوگوں کو عوام پر مسلط کر دیا گیا، دنیا کے اکثر مسلم ممالک ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی بنا پر محض ان کے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں، ان میں خانہ جنگی اور انتشار پیدا کر کے انہیں ابھرنے اور پنپنے کے لائق ہی نہیں رکھا گیا ہے، وسط ایشیا میں اسلام کی کامیابی

کے امکانات کو ختم کر دینے کے لیے ہر قسم کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

اس وقت مغربی ممالک احیائے اسلام کی بعض تحریکوں اور اسلامی بیداری کی اس لہر کو جو بعض مسلم ملکوں میں پیدا ہوگئی ہے اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں اور اسے بنیاد پرستی (Fundamentalism) کہہ کر بدنام کر رہے ہیں، افغانستان میں مجاہدین کی فتح اور وسط ایشیا میں مسلم ریاستوں کی آزادی سے ان کے اندیشے بہت بڑھ گئے ہیں، یونان کے وزیر دفاع نے اسلامی بنیاد پرستی کو صرف یونان ہی نہیں تمام یورپ کے لیے خطرہ بتایا ہے اور تشویش ظاہر کی ہے کہ یونان یورپ میں صرف ایک عیسائی جزیرہ بن کر رہ جائے گا اور بحیرۂ روم اسلامی بنیاد پرستوں کے نرغہ میں چلا جائے گا، اس لیے یورپ اور امریکہ اسلامی بنیاد پرستی کا قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں تعجب ہے کہ ہندوستان بھی اسکی ہمنوائی کر رہا ہے جس کے رہنمائے اعظم گاندھی جی ابوبکر و عمر جیسی حکومت قائم کرنے کے آرزومند تھے۔

افغانستان اور دوسرے مسلم ملکوں کی بنیاد پرستی پر تو ہندوستان واویلا کر رہا ہے لیکن اسے اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی بنیاد پرستی اور ہندو احیائیت پسندی کی کوئی پروا نہیں، فرقہ واریت کے جنون نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے آئے دن کے تشدد اور فساد نے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے ان کی دینی و تہذیبی یادگاریں برباد کی جا رہی ہیں، بابری مسجد کو مندر میں تبدیل کرنے کے نت نئے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، پہلے اسے عملاً مندر میں تبدیل کر کے وہاں پوجا پاٹ کی جا رہی ہے اور اب عدالت کے حکم کو نظر انداز کر کے خود یوپی کی حکومت نے قوت و اقتدار کے نشہ میں مسجد کو مندر بنانے کا کام شروع کرا دیا ہے لیکن کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی، مرکزی حکومت اور اس کے وزیر اعظم صرف بیان دے کر اور سیکولر پارٹیاں پارلیمنٹ میں شور و غل کر کے اپنے کو بری الذمہ سمجھ رہی ہیں۔

ہندوستان کا تذکرہ ضمناً آ گیا تھا، یورپ فتح ایوبی کا انتقام اور خلافت عثمانیہ کا بدلہ

بوسینا اور ہرسک کے مسلمانوں سے لے رہا ہے جن کی بھاری اکثریت ہے اور عیسائی اقلیت میں ہونے کے باوجود ان کے حاکم بنے ہوئے ہیں اور ان کا قتل عام کر رہے ہیں یہ دنیا پر یورپ کی سیاسی بالادستی کا کرشمہ ہے، یوگوسلاویہ کے فوجی اور سربین عیسائی دہشت گرد گھروں میں گھس کر عورتوں اور بچوں کو ذبح کر رہے ہیں، مساجد، مدارس اور اسلامی مراکز کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، مسلم لیڈروں اور علما کو خاص طور پر ہلاک کیا جا رہا ہے تاکہ اسلام اور مسلمان نیست و نابود ہو جائیں اور یورپ میں کوئی آزاد مسلمان ریاست باقی نہ رہے، مسلمان ہونے کی یہی سزا ہر دور میں رہی ہے، وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ کہنے کو آزادی و حریت کی ہوائیں ہر طرف چل رہی ہیں اور ہر حکومت انصاف و جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر رہی ہے لیکن بوسینا اور ہرسک کے مظلوم اور مجبور مسلمانوں کے معاملہ میں سب نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

ع اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی۔

گذشتہ مہینہ کے شذرات میں لکھا گیا تھا کہ "دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عمادالملک اور تیسرے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ہوئے" (ص ۴۰۳) یہ غلط ہے، معارف کے شروانی نمبر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مضمون میں بھی یہ غلطی موجود ہے، دراصل پہلے صدر نواب عمادالملک بلگرامی اور دوسرے مولانا شروانی تھے، جسٹس مولوی کرامت حسین نائب صدر تھے، ناظرین تصحیح کر لیں۔

ان صفحات میں معارف کی توسیع اشاعت اور اس کے خسارے سے شایع ہونے کا ذکر متعدد بار ہو چکا ہے اس کے باوجود بعض قومی انجمنوں اور اداروں سے اسے مفت طلب کیا جاتا ہے جس کی تعمیل سے معذوری ہے۔

مقالات

اورنگزیب اور بعض ہندو راجاؤں کا تقابلی مطالعہ

از

جناب عبدالروٴف خاں ایم۔ اے۔

تاریخ کی کتابوں میں اورنگ زیب کو جس طرح پیش کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو کش، ظالم اور ستمگر تھا۔ لیکن اس کی تصویر کا صرف یہی ایک رخ غیر معروضی طریق مطالعہ کے سبب سامنے آتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ کا مقصد صداقت کی تلاش ہے جو ہمہ جہتی ہوتی ہے، نہ کہ یک رُخی۔ اس لیے ایک حقیقت پسند مورخ کا رویہ تجزیاتی اور ذہنی تعصبات سے اسی طرح مبرا ہونا چاہیے جتنا کوئلے اور ہیرے کے ٹکڑوں کے سلسلے میں ایک ماہر کیمیاگر کا ہوتا ہے۔ مرہٹہ تاریخ کا مشہور مورخ گووند سکھارام سردیسائی لکھتا ہے: "مرہٹوں کے دشمنوں اور معاندین نے انھیں ہمیشہ غلط سمجھا۔۔۔۔۔ مرہٹوں کے زوال کے دوران میں اور اس کے بعد بھی انھیں بد سے بدتر ثابت کیا گیا ہے گویا ان میں کوئی خوبی تھی ہی نہیں"۔ لیکن افسوس کہ اس طرح کے مورخ اورنگزیب کے سلسلے میں اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کی کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کرتے۔ جبکہ سمراٹوں، راجاؤں اور مرہٹوں بشمول پیشواؤں کے متعصبانہ، معاندانہ اور غیر رواداراً و غیر عادلانہ افعال کی توجیہ و تاویل کرتے ہوئے ان کے سیاہ کارناموں پر پردہ ڈالنے کی

کوشش کرتے ہیں یعنی بحیثیت حکمراں (گو ان میں سے اکثر کی حکمرانی ثانوی اور ذیلی حیثیت کی تھی) ان سے کسی غلطی کا ارتکاب ہی نہ ہوا۔ اور وہ بڑے رعایا پرور اور فرشتہ سیرت انسان تھے۔ یہ نظریہ اس آزاد ملک کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے نہایت خطرناک ہے جسے اورنگزیب نے اپنے زور بازو کے ذریعہ کشمیر سے کنیا کماری اور کامروپ سے کابل تک حقیقی معنی میں ایک سیاسی وحدت عطا کی اور صحیح معنی میں ایک قوم (Nation) بنایا۔

یہاں اورنگزیب کی رواداری اور ہندوؤں کے ساتھ اس کے اچھے برتاؤ کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مختلف عہد کے غیر مسلم حکمرانوں نے غیر قوموں کے باشندوں اور غیر مذاہب کو ماننے والی رعایا کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا اس میں تقابلی مطالعہ کیا جائے گا۔

ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمز نئی دہلی مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۶ء میں جناب رائیشور ابادھیائے اپنے مضمون بعنوان "جکھبڑ کا جوگی اور مغل بادشاہ" (जखबड़ का जोगी और मुग़ल बादशाह) میں رقمطراز ہیں کہ "اورنگزیب کو ہندو مخالف بادشاہ کا نام دیا گیا ہے۔ مندروں کو توڑنے اور ہندوؤں کو ستانے (प्रताड़ित) کی باتیں اورنگزیب سے متعلق ملتی ہیں۔ لیکن جکھبڑ مٹھ (خانقاہ) پنجاب میں شاہ عالمگیر کی مہر سے ۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء - ۱۶۶۲ء) میں جاری کیے گئے پروانہ (فرمان) میں سب سے اوپر "हवलअलगनी" (شاید ہو الغنی) لکھا ہوا ہے۔ یہ واقعتہً ایک شاہی خط ہے جو بادشاہ اورنگزیب نے شاید خفیہ طور سے لکھا ہے۔ خط اس طرح شروع ہوتا ہے:

"شیو مورت آنند ناتھ جیو! شری شیو جی مہاراج کے زیر سایہ اب ہندو سکھی اور پرسکون بنے رہیں۔ پوشیدہ طور پر لکھا جاتا ہے کہ آپ مہاراج کا مرسلہ خط مع ۲ تولہ سیماب موصول ہوا۔ مگر یہ سیماب اتنا عمدہ نہ تھا جتنا آپ مہاراج نے

بتلایا تھا۔ اس لیے ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ نہایت اچھی طرح شستہ (शुद्ध) کرکے کچھ (اور) سیماب تیار کرا کے بھجوائیں۔ اس کام میں بلا ضرورت تعویق نہ ہو۔ آپ مہاراج کی گدڑی کے لیے بھی کپڑا اور مبلغ پچیس روپے نذرانے کے طور پر بھیجے جا رہے ہیں۔ جو آپ مہاراج کو پہنچیں گے۔ اس کے ساتھ ہی فتح چند (شاید مقامی کروڑی یا محکمہ گیرائی کا کوئی ذمہ دار) کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ روزانہ آپ کی حفاظت کرتا رہے اس جانب (میرے لائق) کوئی بھی کار خدمت ہو تو فوراً لکھیں۔ اور زیادہ کیا لکھوں"

بادشاہ اورنگزیب کا یہ خط جو جکھبڑ کے مٹھ میں موجود ہے، تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔[۲]

اورنگزیب کے شاہی خزانہ سے مندروں کے لیے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا اور مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کے لیے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس (۴۰) فرمان دستیاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔[۳] شمالی ہندوستان میں اجین کے علاوہ بہت سے مندروں کے پجاریوں اور مالکوں کے پاس اورنگزیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں مندروں کو جاگیریں عطا کرنے کا حکم ہے۔ اس طرح کے دو فرمان ابھی تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اڈیل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔[۴] کئی ہندو خاندانوں کو بیت المال کی ملکہ اراضی سے زمین کا عطیہ دیے جانے کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ اس نے ۱۶۸۷ء میں بنارس کے رام جیون گوسائیں اور اس کی اولاد کو (جو اپنی قوم کے لیے مذہبی خدمات میں مصروف رہتے تھے) گنگا کے کنارے بینی مادھو

گھاٹ کے قریب اراضی بیت المال سے تقریباً چھ سو گز کا ایک قطعہ بطور انعام موروثی طور پر عطا کیا تھا۔[۲۵] راقم الحروف کے گاؤں اردئی کلاں میں موہن پوری گوسائیں کے اجداد کو ان کی مذہبی خدمات کے صلہ میں نو سو بیگھہ زمین کا فرمان بھی اورنگزیب ہی نے دیا تھا۔ جس پر موہن پوری کا متبنیٰ آج تک قابض و متصرف ہے۔ تروینی سنگم کے قریب سومیشور ناتھ مہادیو کے مندر کے پجاری کو ٹھاکر جی کے بھوگ اور پوجا کے لیے دو گاؤں عطا کیے تھے۔ جنگموں کو جو شیومت کی ایک شاخ ہے چار فرمانوں کے ذریعہ معافی کی زمین عطا کی گئی ...... مہاکال مندر اجین بالاجی مندر چترکوٹ کا ماکھیا مندر گوہاٹی، جین مندر گرنار، دلواڑا مندر آبو اور گرودوارہ رام رائے دہرہ دون وغیرہ مندروں کو جاگیریں اورنگزیب نے ہی عطا کی تھیں۔ اس نے ان مندروں کو جاگیریں عطا کرتے ہوئے یہ ہدایت دی تھی کہ ٹھاکر جی سے وہ اس بات کی دعا مانگیں کہ اس کے خاندان میں تا قیامت حکومت بنی رہے۔[۲۶]

دکن میں اورنگزیب نے زمانۂ شہزادگی میں کئی سال بحیثیت صوبیدار اور بعد ازاں اپنے دور شاہنشہی میں اپنی زندگی کے آخری پچیس سال صرف کیے۔ جہاں اس نے اپنے جلوس کے ستائیسویں سال (سنہ ۸۴-۱۶۸۳ء) غارہائے ایلورا کا معائنہ کیا۔ یہاں بدھ اور ہندو زمانے کے مذہبی مندروں اور بتوں کی سنگ تراشی دیکھنے کے لیے آج بھی یورپ اور امریکہ کے لوگ آتے ہیں۔ ان بتوں کی صناعی کو دیکھ کر اورنگزیب نے فرمایا: "ایلورا کہ از عجائبات صنع صانع حقیقی سبحانہ است[۲۷]......" اگر وہ متعصب ہوتا تو ان مورتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا۔ اس شہادت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اورنگزیب ہندو مخالف نہ تھا۔ اگر وہ انہدام منادر میں دلچسپی ہی رکھتا

تو ان غارہائے ایلورا کی سنگ تراشی کو وہ اسقدر کیوں پسند کرتا۔ اور کیوں اتنی تعریف کرتا

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہندو راجاؤں نے مندروں کو منہدم کیا مثلاً سلطنت عہد (سنہ ۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) سے پیشتر راجہ جے پیڑا (Jayapida) شنکر ورمن، ادھی پتو دیم اور ہرش نے کشمیر میں کئی مندر منہدم کیے۔[۲۸] دوسرے مقامات پر بھی بہت سے مندروں کو خود ہندو راجاؤں نے اور مرہٹوں نے منہدم کیا۔ جین اور بودھ مذاہب والوں پر ہندوؤں نے جو مظالم ڈھائے ان کے بیان کا یہ موقع نہیں، صرف انہدام مساجد کے سلسلہ میں اختصاراً عرض کرنا ہے جو تقریباً ہر دور میں جاری رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

رام راج مقتول ۹۷۲ھ (سنہ ۱۵۶۴ء تا ۱۵۶۵ء) والی بیجانگر کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ نہایت تعصب آمیز اور نفرت انگیز تھا۔ اس کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے دربار میں کسی مسلمان سفیر کو داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ رام راج کی فوج جب حسین نظام شاہ کے یہاں (احمد نگر) پہونچی تو اس نے آبادی کو قتل کیا، عمارتوں کو آگ لگادی، مسجدوں میں گھس کر ان کی بے حرمتی کی، انھیں اصطبلوں میں تبدیل کر دیا۔ چھتوں اور دیگر اشیاء حتی کہ مصاحف (قرآن کی جلدوں) کو نذر آتش کر دیا۔[۲۹] (در مساجد فرود آمدہ بت پرستی می کردند و ساز نواختہ سرود می گفتند") دوسری جگہ لکھتا ہے "دست دراز کردہ مساجد و مصاحف سوختند" (فرشتہ جلد دوم) اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں حوالی گجرات میں ہندوؤں نے مسجدوں پر قبضہ کر لیا تھا اور عمارتیں تعمیر کر لی تھیں۔ انھیں شاہ جہاں نے واگذاشت کرایا (در ہر جا کہ مسجدے در زیر عمارت ہنود در آمدہ بود بقدر تحقیق آں را امراز نمود) (صاحب شاہ جہاں نامہ) عہد اکبر میں

متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد کی تعمیر کے لیے سامان جمع کیا۔ لیکن اُسے جودھابائی کے پروہت نے راتوں رات اٹھا کر ایک مندر کی تعمیر میں استعمال کر لیا[۹]۔ تھانیسر میں ہندوؤں نے اکبر ہی کے زمانے میں بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معابد و منادر تعمیر کیے۔ کوروکشیتر میں تالاب کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا اس کو گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنا دیا گیا[۱۰]۔ ہنٹر صاحب اپنی تصنیف تاریخ ہند میں لکھتے ہیں کہ راجپوتوں نے مسجدوں کو مسمار اور مسلمانوں کو بے عزت کیا نیز قرآن کو جلایا۔ ۱۷۶۰ء میں سداشیو رائے بھاؤ نے دہلی میں بڑے مظالم ڈھائے دیوان خاص میں لگی چاندی کی چھت کو اکھاڑ لیا۔ مساجد و مقابر کو لوٹا اور مسمار کیا۔ راجگان کشمیر، بھرت پور اور بانسوڑہ نے مساجد منہدم کیں۔ بعض مساجد کو دفتروں اور گوداموں میں استعمال کیا۔ سرینگر کی قدیمی مسجد جو پتھر مسجد کے نام سے مشہور تھی اس پر ریاست نے قبضہ کر لیا اور پولیس و دفتر کے کام میں استعمال کیا گیا۔ لاہور میں ایک مسجد پر راجہ رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا تھا۔ شہید گنج واقع چاندنی چوک دہلی میں ایک مسجد کو منہدم کر کے وہاں گرنتھ صاحب بنایا گیا۔ کوروکشیتر کے قریب ایک مسجد کو گوردوارہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہیبت رائے پھالکہ مرہٹہ نے ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱-۷۲ء) میں قصبہ سیوہارہ میں جامع مسجد کو جلایا اور مسمار کر دیا اور منہدمہ حصہ کو مرغ بازی کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس زمانہ میں کسی شاعر نے مسجد کا مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

رہا کردہ برائے مرغ بازی   عبادت گاہِ مردانِ نمازی[۱۲]

مہاراجہ اجیت سنگھ (مقتول ۲۳ر جون ۱۷۲۴ء) نے عہد فرخ سیر میں جودھپور

کی کئی مساجد کو شہید کر کے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے۔ باقی مساجد میں اذان دینے کی ممانعت کر دی[۱۳]۔ کنہیا لال کپور نے اپنی تاریخ لاہور میں سکھوں کے زمانۂ عروج میں جتنی مساجد کی بے حرمتی کی گئی ان کی تفصیل پیش کی ہے[۱۴]۔ افسانۂ شاہاں کی ایک روایت کے مطابق بہار کے ایک ہندو راجہ نے اپنے زیر اثر علاقہ میں عثمانی النسل مسلمانوں کو شدھی کر لیا تھا۔ اور ان میں سے جنھوں نے اسلام ترک کرنے سے انکار کیا انھیں قتل کروا دیا۔ رانا سانگا نے راجستھان (راجپوتانہ) میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اس نے ابراہیم لودھی کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ناگور، اجمیر اور مانڈل گڑھ (نزد چتوڑ گڑھ) کی قدیم اسلامی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور وہاں کی مسلم آبادی نے بھاگ کر احمد آباد میں پناہ لی۔ ہیمو بقال نے اپنے دور اقتدار میں بہت سے اسلامی شعائر کی ادائیگی پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس کی جنم بھومی ریواڑی میں سیدوں کا ایک خاندان آباد تھا۔ انھوں نے اپنے ایک بچے کی پیدائش پر عقیقہ کیا۔ شومیِ قسمت سے کسی چیل یا کوے نے ایک ہڈی اٹھا کر ہمسایہ ہندو کے گھر میں پھینک دی۔ اتنی سی بات سے مشتعل ہو کر ہیمو بقال نے سیدوں کے پورے خاندان کو ذبح کروا ڈالا[۱۵]۔

مغربی ساحل پر بمقام قصبہ "Cheul" (چیول یا شیول) مرہٹہ کمانڈر راجی مہادیو بوالکر نے ایک مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اسے زمین دوز کر دیا۔ اجین میں سلطان التمش کی تعمیر کردہ مسجد کو مرہٹہ سردار رانوجی سندھیا نے شہید کر کے اس کی جگہ مہاکال مندر تعمیر کرایا۔ ملہار راؤ ہلکر نے بنارس پر قابض ہوتے ہی عالمگیری مسجد کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ مگر بنارس کے چند منصف مزاج برہمنوں نے پیشوا سے

مداخلت کی درخواست کی کہ ہلکر کو انہدام مسجد سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ بادل ناخواستہ ملہار راؤ ہلکر کو اپنے ناپاک منصوبہ کو ترک کرنا پڑا (بفرض محال عالمگیری مسجد وشوناتھ مندر کے کھنڈرات پر ہی تعمیر کی گئی تھی تو بنارس کے برہمنوں نے کیوں احتجاج کیا؟) متھرا کی مسجد کے فلک بوس میناروں کو دیکھ کر سداشیو راؤ بھاؤ غضبناک ہوا تھا۔ اور اس نے سورج مل جاٹ (بھرت پور) سے جو اس سے ملاقات کرنے متھرا حاضر ہوا تھا قہر آلود لہجے میں کہا "کتنے شرم کی بات ہے کہ تم اپنے آپ کو ایک ہندو کہتے ہو مگر پھر بھی تم نے یہ مسجد اتنے عرصے تک یہاں کھڑی رہنے دی۔"[16]

You profess to be a Hindu; but how is it
That you have kept This mosque standing
so long.

اس کے برعکس ایلورا کے غاروں کے بارے میں اورنگزیب کا طرز عمل اور رویہ گزشتہ سطور میں گذر چکا ہے۔

شیواجی نے ۴ر نومبر ۱۶۷۹ء میں جالنا میں خدارسیدہ بزرگ سید جان محمد کی خانقاہ کو لوٹا اور تباہ و برباد کیا۔ جب شیخ نے انھیں اس کام سے باز رہنے کیلئے کہا تو شیخ کے ساتھ بدکلامی کی گئی۔ شیخ نے جو مستجاب الدعوات تھے شیواجی کے حق میں بددعا کی اور نتیجۃً پانچ ماہ بعد نہایت مایوسی کے عالم میں ۳ر اپریل ۱۶۸۰ء کو وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔[17] عام رواج کے برخلاف شیواجی نومسلم لوگوں کو شدھی بھی کیا کرتا تھا۔ بالاجی نمبالکر اور نیتاجی پالکر اس کی مثال ہیں۔[18] جواہر سنگھ جاٹ نے دہلی کو بھی بھر کر لوٹا اور شاہی محلات اور علاقوں کو بے رحمی سے تاخت و تاراج کیا،

اس نے علی گڑھ پر قبضہ کرکے اس کا نام رام گڑھ رکھ دیا۔ راجہ رام جاٹ نے سکندرہ میں اکبر کے مقبرہ کو تہس نہس کر ڈالا۔ ڈاکٹر قانون گو نے راجہ رام کے اس فعل کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔[19]

آزادی کے بعد جتنی مساجد کو شہید کیا گیا ان کا شمار محال نہیں تو مشکل ضرور ہے، معمولی نوعیت کے واقعات رونما ہونے پر مساجد کو شہید کرنا برادران وطن کا معمول بن گیا ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ء میں گنگاپور سٹی کالج میں ایک مسلم طالبعلم کا غیر مسلم طلبہ سے جھگڑا ہوگیا۔ جس میں ایک غیر مسلم لڑکا مارا گیا۔ نتیجۃً گنگاپور سب ڈویژن کے پانچ دیہاتوں بامنواس میں دو، گڑھ کھیڑا، گڑھ مورا اور ریلوندا میں ایک ایک مسجد کو شہید کردیا گیا۔ یہ چھ مساجد تادم تحریر منہدمہ شکل ہی میں ہیں اور زبانِ حال سے برادران وطن کے ظلم و ستم پر شکوہ سنج ہیں۔

مسلم فرماں رواؤں اور خصوصاً اورنگ زیب پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے احیائے اسلام اور ترویج شریعت کے لیے قوانین نافذ کیے تاکہ مسلمانوں کی بالادستی قائم رہے۔ یعنی مجموعی حیثیت سے وہ قوانین صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے تھے جو آگے چل کر مغل سلطنت کے زوال کا باعث ہوئے۔ یہاں ہم اورنگزیب کی اس پالیسی سے صرف نظر کرتے ہوئے پیشواؤں کے عہد حکومت کی نام نہاد رواداراۃ، عادلانہ اور وسیع المشرب حکمت عملی کی ایک جھلک پیش کرنا چاہیں گے۔ جن کا پورا انتظام حکومت برہمنوں کی بالادستی قائم کرنے اور ان کی حفاظت و صیانت نیز فلاح و بہبود کے لیے وقف تھا۔ یہاں تک کہ عدالتیں جن کا مقصد بلاامتیاز مذہب و ملت ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا ہوتا ہے محض برہمنوں کی حفاظتی

چوکیاں بن کر رہ گئی تھیں۔ کیونکہ پیشواؤں کے برہمن راج کی تمام تر عدالتی کارروائی "منوسمرتی" کے منصفانہ (۹) قوانین پر منحصر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پیشواؤں کے عہد حکومت (۱۷۱۳ء تا ۱۸۰۲ء) میں حدود قائم کرنے کے سلسلے میں برہمن اور غیر برہمن مجرمین کے مابین زمین آسمان کا فرق روا رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر قانون گو اس کارروائی کو الٹی گنگا بہنے کے مترادف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"This was putting the hand of clock to a point of out-of-date antiquity rather an attempt to make the tide of the Ganges flow back from the Sangam to the glaciers of the Gangotri"

(Historical Essays P1197 ed 1960)

یہاں مرہٹوں کی عدالتی کارروائی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

گوبند بھٹ نامی برہمن نے ایک دس سالہ بچی کے ساتھ اپنا منھ کالا کیا جس سے بچی کی موت واقع ہو گئی۔ معاملہ عدالت میں پہونچا تو عدالت نے اس دوہرے جرم زبوں کی پاداش میں گوبند برہمن کو صرف بنارس کی یاترا کرنے اور واپس آکر سوا سو برہمنوں کو "بھوج" (دعوت) دینے کی سزا تجویز کی جبکہ ایک غیر برہمن باباجی وشنو پربھو کایستھ کے ہاتھوں ایک برہمن کا قتل سرزد ہو جانے کے مکافات میں اولاً اس کی منقولہ و غیر منقولہ تمام جائداد کو ضبط کیا گیا اور بعد ازاں اسے تختۂ دار پر چڑھا کر ملکِ عدم کو پہونچا دیا۔

بلرام منی رام نامی ایک غیر برہمن کی نظر کسی برہمن عورت پر پڑ گئی جس کی پاداش میں ملزم مذکور پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ دوسری طرف مسمیٰ مہادیو بھٹ برہمن کی بیوی نے ایک برہمن کو قتل کر دیا جسے سزا کے طور پر صرف برادری سے خارج کیا گیا۔ مگر بعد میں ہندو شاستروں کے عالم "شری رام شاستری" نے فتویٰ صادر کیا کہ چونکہ مجرم ایک برہمن عورت ہے اس لیے اسے اتنی سخت سزا نہ دی جائے اور صرف شری ترئیم کیشورم کے مندر کی چند پریکرما (طواف) کرائے جانے پر اکتفا کیا جائے۔[20]

مندرجہ بالا مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ پیشواؤں کے برہمن راج میں زنا بالجبر اور قتل جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کے ارتکاب پر اگر مجرم برہمن ہو تو اسے صرف چند ماہ جاپ کرنے یا بنارس اور رامیشورم کی تیرتھ یاترا پر بھیجنے کی سزا دینا کافی تھا جس کا صرفہ بھی سرکاری خزانے سے ادا کیا جاتا تھا یعنی سرکاری صرفہ سے بھارت بھرمنتر (भ्रमण) جبکہ اسی نوعیت کے جرائم کے مرتکب غیر برہمن مجرم کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جاتا تھا۔[21]

ملازمتوں کے سلسلے میں بھی صرف برہمنوں کو اہمیت حاصل تھی جو بہتر فیصد عہدوں پر قابض تھے۔ گویا پیشوا راج برہمنوں کا، برہمنوں کے ذریعہ برہمنوں کیلئے تھا جس میں غیر برہمن شہریوں کی حیثیت ثانوی تھی

The government of the Peshwas was a government of the Brahmans, by the Brahmans and for the Brahmans under which other castes were relegated to a secondary position[22]")

اس جانبداری کی صفائی میں گوبند سکھا رام سردیسائی لکھتے ہیں کہ بیشک یہ بات سچ ہے کہ اس عہد میں اکثر برہمن خاندانوں کو اہم عہدے حاصل ہوئے، خصوصاً پیشواؤں کے آخری دور میں۔ لیکن یہ تو محض انسانی فطرت ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہے اور کوئی کام کرانے کے لیے مجھے کسی کو نوکر رکھنا ہے تو یہ بالکل فطری عمل ہے کہ ایسے آدمی کا انتخاب کروں گا جسے ذاتی طور پر جانتا ہوں اور جس پر میں اعتماد کر سکتا ہوں۔ ...... اس لیے اس بات کے لیے انھیں ہدفِ تنقید بنانا کہ انھوں نے صرف ایک ذات کے لوگوں کو ملازم رکھا مناسب نہیں ہے[23]۔ یہاں ناطقہ سر بگریباں اور خامہ انگشت بدنداں ہے کہ اس مضحکہ خیز دلیل کو کیونکر مسترد کیا جائے۔

واضح ہو کہ باقی پچیس[25] فیصد ملازمین میں بھی ہندوؤں کی دوسری برادریوں کے افراد تھے نہ کہ مسلمان۔ اس کے برعکس اورنگزیب کے عہد حکومت میں اکتیس اعشاریہ چھ فیصد منصبدار ہندو تھے جو ایرانی، تورانی، افغانی، ہندوستانی (مسلمان) اور مغل منصبداروں کے بالمقابل اکثریت میں تھے۔

ہندو عہد حکومت میں جینیوں اور بودھوں پر جو مظالم ہوئے انھیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ بودھ مذہب کو ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے جلاوطن ہی کر دیا گیا۔

اورنگزیب پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے باپ کو قید کیا، اور بھائیوں کو قتل کیا۔ اور یہ بات اس انداز میں پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ واحد شہنشاہ تھا جس نے ایسا کیا۔ لیکن اگر ہم تاریخ ہند کا تقابلی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ متعدد سمراٹ اور کئی راجگان اس فعل کے زیادہ مرتکب ہوئے ہیں۔ مہاتما بدھ

کے معاصر مگدھ نریش سمراٹ اجات شترو (تقریباً ۴۹۱ سنہ تا ۴۵۹ سنہ ق م) اپنے باپ بمبسار (۵۴۴ سنہ تا ۴۹۱ سنہ ق م) کو حوالۂ زنداں کیا اور دورانِ اسیری اسے بھوکا پیاسا رکھ کر شدید ایذائیں دیں۔ تاکہ وہ مر جائے۔ جب ایسا نہ ہوا تو اسے قتل کر دیا گیا۔ اجات شترو کے بعد اس کے وارثوں میں سے متواتر تین راجا اپنے اپنے باپ کو قتل کر کے تخت نشین ہوئے۔ جن کے نام اورودس (Orodes) فراتز چہارم (Pharates IV) اور فراتز پنجم تھے[24]۔ ریاست جودھپور کے مہاراجا اجیت سنگھ (۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۴ء) کو اس کے چھوٹے راج کمار بخت سنگھ نے ۲۳ جون ۱۷۲۴ء کو محل سرا میں سوتے ہوئے قتل کیا[25]۔

ان واقعات پر ہم اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی صاحب کے الفاظ مستعار لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو انھوں نے فردوسی کے شاہنامہ کے طنزیہ مقامات کے ذیل میں ضحاک کے بارے میں لکھے ہیں: "ضحاک نے ابلیس کے اکسانے پر اپنے باپ کو قتل کر دیا تاکہ اس کے تخت پر قابض ہو سکے۔ فردوسی یہ واقعہ بیان کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ حقیقی بیٹا کبھی ایسے برے اور ظالمانہ فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا ...... بُرا فرزند اگرچہ شیر نر ہی کیوں نہ ہو باپ کا خون گرانے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا۔ ہاں کوئی خفیہ معاملہ ہو تو پھر تجسس کرنے والے کو ماں کے "راز" کی تلاش ہوگی ؎

که فرزند بد گر بود نرّہ شیر — بخون پدر هم نباشد دلیر
مگر در نهانی سخن دیگر است — پژوهنده را راز با مادر است[26]

ٹکشلا کے معروف دارالعلوم کے سند یافتہ اجات شترو کے ہمعصر راجہ پسینیدی کو اپنے
راجکمار درودک کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر تخت و تاج سے دستبردار ہوکر راہِ
فرار اختیار کرنی پڑی۔ دوران فرار وہ اجات شترو کے یہاں پناہ گزیں ہونا چاہتا تھا
مگر راستے ہی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ گپت خاندان کا مہا سمراٹ چندر گپت ثانی کرما
جیت (۳۸۰ء۔ ۴۱۲ء) اپنے بڑے بھائی سمراٹ رام گپت کو قتل کر کے تخت و
تاج کا مالک بنا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے دونوں راجکمار کمار گپت اور گوبند گپت
ڈھائی تین سال تک حصول تخت کے لیے باہم نبرد آزما رہے۔ آخر میں کمار گپت فتحیاب
ہوکر سلطنت کا مالک بنا۔ اس کے انتقال (۴۵۵ء) کے بعد اس کے دو راجکمار
پروگپت اور اسکندگپت سریرآرائے سلطنت ہونے کے لیے برسرپیکار ہوئے۔
جس میں پروگپت کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا[27]۔ اشوک اعظم کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا کہ
وہ اپنے ننانوے بھائیوں کا خون ناحق بہا کر وارث تخت و تاج ہوا تھا تحصیل حاصل
ہے کہ اس بات کو بچہ بچہ جانتا ہے۔

غیر مذاہب والوں کے ساتھ ہمارے ملک میں عہد عتیق سے لے کر آج تک
جو مخاصمانہ رویہ رہا ہے وہ تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں
برہمن قوم کے اولین حکمران پُشیہ متر شنگ (पुष्यमित्र शुंग) کا یہ واقعہ
بیان کرنا کافی ہوگا کہ وہ جب اپنے آقا موریہ خاندان کے آخری تاجدار برہدرتھ کو
قتل کر کے "سنگھاسن پر براجمان" ہوا تو اس نے اپنی قلمرو میں کثیر بودھ خانقاہوں
کو نذر آتش کیا اور بودھ بھکشوؤں کا قتل عام کرایا۔ سنسکرت تصنیف دیویاودان
(दिव्यावदान) میں مرقوم ہے کہ اس نے سرکاری طور پر اعلان کر دیا کہ جو کوئی

کسی بدھ بھکشو کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سو دینار (طلائی سکہ) عطا کیے جائیں گے[28]
यो मे श्रमण शिरो दास्याति तस्याहं दीनार शतं
दास्यामि)

اسی طرح بنگال کے راجہ ششانک (تقریباً ۶۰۶ء۔ ۶۳۷ء) نے جو ہرش وردھن
کا معاصر تھا بودھ مذہب کے لوگوں پر بے پناہ مظالم کیے۔ اس نے بودھ گیا کی خانقاہ
میں مہاتما بدھ کے مجسمہ کے بجائے شیو کی مورت نصب کرنے کی کوشش کی۔ پوتر بودھی
درخت (برگد) کو کٹوا کر نذر آتش کر دیا۔ کشی نگر میں ایک بودھ خانقاہ کو مسمار کیا۔
پاٹلی پتر (پٹنہ) میں جس پتھر پر مہاتما بدھ کے قدموں کے نشانات بتلائے جاتے
تھے۔ اسے دریائے گنگا میں پھنکوا دیا۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر چینی سیاح
ہوان شوانگ اپنے سفرنامہ میں اسے شریر النفس راجہ کا لقب دیتا ہے۔ ہرش وردھن
اس سے اتنا متنفر تھا کہ اس کا نام تک لینا گوارہ نہ کرتا تھا کہ مبادا زبان آلودۂ عصیاں
ہو جائے[29]۔ ہرش وردھن اور اشوک بھی جو بہت وسیع المشرب خیال کیے جاتے
ہیں، برہمن مخالف تھے موریہ سلطنت کے زوال کا اہم سبب اشوک کی برہمن مخالف
پالیسی ہی تھی۔ اس کے برخلاف اورنگزیب اچھی طرح جانتا تھا کہ حکومت ظلم و زیادتی
کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے وہ ہر معاملہ میں انصاف کو ملحوظ رکھتا تھا۔ خواہ
معاملہ ملازمت سے متعلق ہو یا منصب و جاگیر سے۔ وہ قابلیت کو پیش نظر رکھتا تھا
نہ کہ مذہب کو۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں کہ یہ ایک علیحدہ مبسوط مقالہ کا متقاضی ہے
اورنگزیب کیا تھا اور اس نے ہندوستان پر کیا احسانات کیے اس کا اندازہ جناب
کے۔ آر۔ ملکانی صاحب نائب صدر بھارتیہ جنتا پارٹی کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے

"औरंग जेब दुःसह (ناقابل برداشت) कट्टर और निरंकुश शासक था. लेकिन जब हिन्दू-मुस्लिम समस्या के समाधान से उसकी निरंकुशता भुला दी जाएगी तो हम उसे दिल्ली के ऐसे चक्रवर्ती (عالمگیر) राजा के रूप में याद करेंगे जिस का कानून दक्षिणी भारत से मध्य एशिया तक चलता था"[۳۰]

لیکن آج ہمارے سرکاری اسکولوں میں اساتذہ ملک و قوم کے ان بچوں کے ذہنوں کو جن کے منھ سے ابھی شیر مادر کی بو آتی ہے، اورنگ زیب کے بارے میں کس طرح مسموم کرتے ہیں۔ اور امتحانات کے پرچوں میں کیسے دل آزار و زہر آلود سوالات پوچھتے ہیں وہ درج ذیل سوال سے واضح ہو جائے گا۔ جسے بار بار دوہرایا جاتا ہے:

प्र. स. 5 हिन्दुओं पर अनेक अत्याचार करने वाला मुग़ल सम्राट था ____:
(अ) शाहजहाँ (ब) जहाँगीर (स) औरंगज़ेब (द) बाबर

بقول مولانا سید سلیمان ندوی "ظاہر ہے کہ کسی پوری کی پوری قوم کا دامن خامیوں سے پاک نہیں ہو سکتا اور نہ کسی حکومت کے تمام حکمران عدل و انصاف کا نمونہ ہو سکتے ہیں۔ اور کیا یہ دور جس کو مذہبی تعصب سے خالی کہا جاتا ہے ایسی مثالوں سے

خالی ہے؟ در اصل حکمرانوں کی بہت سی بدعنوانیاں خود ان کی سرشت، ذاتی مصالح اور حکومت کی سیاست کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کو مذہبی و قومی تعصب سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور اس کا اثر بلا تفریق مذہب و ملت سارے محکوموں پر یکساں پڑتا ہے انصاف و دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ان بدعنوانیوں اور بدنما واقعات کو ان کی حدود میں ہی رکھا جائے۔ ان کو آب و رنگ دے کر قومی منافرت کا وسیلہ نہ بنایا جائے اور ان حکمرانوں کے عیوب اور خامیوں کے ساتھ مسلمان حکومتوں اور حکمرانوں کے محاسن، ان کی ملکی خدمات اور کارناموں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ انھوں نے ہندوستان کو جو گوناگوں فوائد پہونچائے اور اس کو جس درجہ کمال تک پہونچایا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کیا اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے والے واقعات کی کمی ہے؟ آخر ان کو کیوں نمایاں نہیں کیا جاتا؟ قومی اتحاد کا یہ زریں اصول یاد رکھنے کے لائق ہے کہ آگے بڑھنے میں پچھلے واقعات پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔ اس زمانہ کی تاریخ محض واقعاتِ ماضی کی کھتونی نہیں ہے، بلکہ اس کو قوموں کے بنانے اور بگاڑنے میں بھی دخل ہے۔ اس لیے تاریخ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔[۳۱]

حواشی

۱ نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز جلد اول دیباچہ ص ۵ مطبوعہ ۱۹۵۹ء آگرہ (ہندی ایڈیشن)
۲ روزنامہ نوبھارت ٹائمز نئی دہلی (ہندی) مورخہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۶ء ۳ نقشہ
المصدر اور ہندوستان کی شرعی حیثیت ص ۵۷۔ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔
۴ ہندوستانی مسلمان تاریخ کے تناظر میں۔ از پنڈت سندر لال مشمولہ ماہنامہ

جامعہ نئی دہلی ص ۲۹ بابت مئی سنہ ۱۹۸۹ء ۔ ۵؎ Iramchandra — Aurangzeb
and Hindu Temples, Journal of Pakistan
Historical Society Vol. V14. P. 250, Oct. 1957.
بحوالہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ ۲۷/۱۴۷ بابت اپریل، جون ۱۹۸۹ء
۶؎ جامعہ نئی دہلی ص ۱۴ مئی سنہ ۱۹۸۹ء ۔ ۷؎ کلمات طیبات از عنایت اللہ خان کشمیری
ص ۱۳ ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عزیز الدین حسین ۔ شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی مطبوعہ
۱۹۸۲ء ۔ شائع کردہ ادارۂ ادبیات دہلی ۔ ۸؎ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ
نمبر ۵۷ ـ ۶۲ ص ۱۷ ۔ انگریزی سیکشن ۔ ۹؎ تاریخ فرشتہ (اردو) ۲ : ۵ ـ ۱۸۴
ترجمہ عبد الحی خواجہ ایم اے دیوبند ۔ ۱۰؎ رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۳۲۱ تاج کمپنی دہلی
۱۹۸۷ء نیز دین الٰہی اور اس کا پس منظر از پروفیسر محمد اسلم ص ۹۱، ۱۳۷ ۔
مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ۱۱؎ حوالہ جات سابق صفحات علی الترتیب ۳۲۲ و ۱۳۷
بحوالہ مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۹۲ ۔ ۱۲؎ برائے تفصیلات ملاحظہ ہو
رسالہ جہاد اسلام از قاضی نور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی ص ۱۳۸ تا ۱۴۱ مطبوعہ
الامان برقی پریس دہلی تاریخ تقریب ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ ۱۳؎ راجستھان کا اتہاس ص ۴۵۹
ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما ۔ ۱۴؎ شذرات معارف ستمبر ۱۹۸۳ء ۱۵؎ دین الٰہی اور اس کا
پس منظر ص ۳۰ ۔ ۱۶؎ ہسٹاریکل ایسیز از ڈاکٹر کے ۔ آر ۔ قانون گو ص ۵ ۔ ۱۱۴ ۔
۱۷؎ شیواجی اینڈ ہز ٹائمز از جدو ناتھ سرکار ص ۸ ۔ ۳۲۷ مطبوعہ فروری ۱۹۶۱ء
نیز نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز جلد اول (ہندی) از جی ۔ ایس ۔ سردیسائی ص ۳۱۶ و
۳۱۹ مطبوعہ ۱۹۵۹ء آگرہ ۔ ۱۸؎ سردیسائی ۱ : ۳۳۵ ۔ ۱۹؎ عبرت نامہ خیر الدین ص ۴۵

۲۰؎ ہسٹاریکل ایسیز ص ۱۲ ـ ۱۱۱ ۲۱؎ ہسٹاریکل ایسیز ص ۱۹۷ بحوالہ پیشوا کالین
بھارت بزبان مرہٹی ۔ ۲۲؎ حوالہ مذکور ص ۱۱۰ ۔ ۲۳؎ مین کرنٹس آف مرہٹہ ہسٹری
ص ۹۰ ـ ۱۸۹ (ہندی ایڈیشن) ۲۴؎ پراچین بھارت کا اتہاس از ڈاکٹر رما شنکر
ترپاٹھی ص ۲ ـ ۷۵، ۷ نیز ص ۸۴ ۔ فوٹ نوٹ ۳ مطبوعہ ۱۹۶۲ء ۲۵؎ لیٹر مغلز
از اروِن جلد دوم ص ۱۷ ـ ۱۱۶ جودھپور راج کا اتہاس ص ۳۰۰ از پنڈت گوری شنکر
ہیرا چند اوجھا ۔ راجستھان از ٹاڈ ۲ : ۸ ـ ۵۵۷ ۔ ۲۶؎ معارف اعظم گڈھ بابت
اپریل ۱۹۸۱ء ص ۳ ـ ۲۹۲ ۔ ۲۷؎ پراچین بھارت کا اتہاس از ڈاکٹر ومل چندر
پانڈے ص ۶۴، ۹۹ نیز ۱۰۷ مطبوعہ ۱۹۶۲ء ۲۸؎ دیو یاودان مرتبہ کاویل اور نیل
ص ۴ ـ ۴۳۳ بحوالہ رما شنکر ترپاٹھی ص ۱۴۳ ۲۹؎ ومل چندر پانڈے ص ۶۰ فوٹ
نوٹ ۱ ۔ ۳۰؎ ترجمہ :۔ اورنگ زیب ناقابل برداشت، کٹر اور مطلق العنان
حکمران تھا لیکن جب ہندو مسلم (فرقہ واریت) کے مسئلہ کی تحلیل ہو جانے پر اس کی
مطلق العنانی فراموش کر دی جائے گی تب ہم اسے دہلی کے ایک ایسے عالمگیر شہنشاہ
کے روپ میں یاد کریں گے جس کے قوانین جنوبی ہند سے وسط ایشیا تک نافذ تھے
(بہ شکریہ ہفتہ وار "دھرم یگ" ۱۲ فروری ۱۹۷۸ء ص ۱۹) ۳۱؎ دیباچہ
"تاریخ سندھ" ص ۱۲ و ۱۳ ۔ ع ۹ یہ سوال ضلع سوائی مادھو پور میں سالانہ امتحان
۱۹۸۵-۸۶ء، ۱۹۸۷-۸۸ء، ۱۹۸۸-۸۹ء اور ۱۹۹۰-۹۱ء میں درجہ ہفتم کے پرچہ میں احتجاج
کے باوجود لگاتار آیا ہے جن کی فوٹو کاپی مدیر معارف کی خدمت میں چند روز پہلے پیش کر دی
گئی ہیں ۔ مذکورہ سوال کا جواب بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جواب صرف اورنگزیب ہے ۔

گجرات کے بعض سلاطین، امراء و مشائخ

از مولانا یوسف متالا صاحب

(۳)

مرزا نظام الدین احمد بخشی

مرزا خواجہ نظام الدین احمد ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ باپ کے زیر سایہ تربیت پائی۔ ان کے اساتذہ میں ملا علی شیر کا نام ملتا ہے جو اپنے زمانہ کے ایک فاضل اور شیخ فیضی مولف اکبرنامہ کے والد تھے۔

خواجہ نظام الدین احمد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شعر و ادب سے بھی ذوق تھا۔ گجرات میں بخشی ہونے کے باوجود علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ ملا حسن علی موصلی مشہور فاضل جب گجرات پہونچے تو خواجہ نظام الدین احمد اور ان کے بیٹے محمد شریف نے ان سے استفادہ کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ایک واقعہ لکھا ہے اس سے اہل علم سے انکی بے تکلفی و علمی جستجو کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"ملا ظلم کابلی ایک دن فتح پور میں مجھے اور مرزا نظام الدین احمد کو صبح کے وقت زبردستی اپنے مکان پر لے گئے اور وہاں انھوں نے ایک معجون کھلائی جس سے بھوک لگی اور کھانے کی خواہش بڑھتی چلی گئی۔ پھر اپنی کتابیں دکھانی شروع کیں۔ صبح سے دوپہر تک ہم دونوں نے بھوک کی مصیبت اٹھائی۔ آخر مرزا

نظام الدین نے کہا کہ کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں سمجھا تھا کہ آپ کھانا کھا کر آئے ہوں گے"[1]

خواجہ نظام الدین احمد کی علمی تربیت اور فن تاریخ سے دلچسپی ان کے والد کی رہین منت ہے، ان کے والد نے انہیں تاریخی کتب پڑھنے کا حکم دیا تھا اس کی بنا پر بعد میں خواجہ نظام الدین کو علم تاریخ سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ طبقات اکبری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اکبر بادشاہ نے ان کو تاریخ الفی کے مولفین میں شامل کیا۔ خواجہ نظام الدین علوم شرعیہ میں بھی پوری دسترس رکھتے تھے، چنانچہ ان کی معلومات کے ذخیرہ کی بنیاد پر ملا عبدالقادر کی مشہور کتاب نجات الرشید وجود میں آئی۔ تصوف سے بھی تعلق تھا اور مشائخ و صوفیہ سے ارادت و عقیدت سے پیش آتے تھے۔

جب خواجہ نظام الدین سن رشد کو پہونچے تو شاہی ملازمت میں آئے۔ ذخیرۃ الخوانین کے مولف شیخ فرید بھکری نے لکھا ہے کہ وہ شروع میں اکبر بادشاہ کے دیوان حضور رہے۔ خواجہ صاحب آگرہ میں سید جلال قادری کے قریب رہتے تھے[2]۔ ۹۹۱ھ میں مرزا نظام الدین احمد گجرات میں بخشی مقرر ہوئے چنانچہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

"اکبر بادشاہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اعتماد خاں نے برسوں گجرات پر حکومت کی ہے، وہ گجرات کو آباد رکھنے کے طریقے دوسروں سے بہتر جانتا ہوگا۔ اگر گجرات پر اس کو حاکم بنا دیا جائے تو ان شہروں کے حکام کی امیدواری کا سبب ہوگا جو ابھی قبضہ میں نہیں آئے۔ چنانچہ گجرات کی حکومت اعتماد خاں کے سپرد کر دی گئی۔ میر ابو تراب کو امین بنایا۔ ملا عبدالقادر آخوند کے بھائی خواجہ

---

[1] طبقات اکبری ج ۱ [2] ایضاً ج ۲۔

ابوالقاسم کو دیوانی منصب عطا ہوا اور اس کمترین بندہ نظام الدین احمد مولف
تاریخ کو بخشی گری کی خدمت پر مقرر کیا۔[1]

گجرات کی نظامت شہاب الدین کی بجائے اعتماد خاں کے سپرد ہوئی اس بات سے
شہاب الدین نہ صرف ناراض ہوا بلکہ اس نے بغاوت کر دی دوسرے لوگ بھی
اس کے ساتھ شریک ہو کر مظفر شاہ گجراتی کے پاس پہونچے، اعتماد خاں اور
خواجہ نظام الدین احمد نے اس شورش کو رفع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن
کامیابی نہیں ہوئی۔

۹۹۱ھ میں مظفر شاہ گجراتی لشکر سے کر دھولکہ آ گیا۔ اس وقت اعتماد خاں
اور خواجہ نظام الدین احمد شہاب الدین کو فہمایش کر کے واپس لانے کے لیے گئے
ہوئے تھے۔ شہر کی حفاظت اعتماد خاں کا بیٹا شیر خاں خواجہ نظام الدین کا بیٹا
محمد شریف اور میر معصوم کر رہے تھے۔ مظفر شاہ کے لشکر نے مغلیہ فوج سے
مقابلہ کی کوشش کی۔ اب شہاب الدین نے مغلوں کی طرف سے غیر معمولی طرفداری کا
اظہار کیا مگر ناکامی ہوئی۔

اس ہنگامہ کے بعد مظفر شاہ کے ایک جنرل شیر خاں فولادی کو دو ہزار سپاہیوں
کے ایک دستہ سے خواجہ نظام الدین احمد نے بری طرح شکست دی۔ شیر خاں
سیدھا احمد آباد کی طرف روانہ ہو گیا اعتماد خاں اور نظام الدین احمد نے احمد آباد
دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کی لیکن فوج کی کمی کے باعث وہ کامیاب نہ ہو سکے۔
چنانچہ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے مرزا عبدالرحیم خانخاناں مقرر ہوئے۔

۱؎ طبقات اکبری ج ۲۔

سرکھیج کے میدان میں زبردست مقابلہ ہوا مغلوں کو فتح نصیب ہوئی اور گجرات پر
ان کا قبضہ ہو گیا اس موقع پر خواجہ نظام الدین احمد نے نہایت جرأت و بہادری اور
قابلیت و حکمت عملی کا ثبوت دیا۔[1] ان معرکہ آرائیوں میں مرزا عبدالرحیم خانخاناں
نے اکثر موقع پر خواجہ نظام الدین احمد سے مشورہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ خواجہ
نظام الدین احمد، مرزا عبدالرحیم کے ماموں تھے۔

ان معرکوں کے دوران مظفر شاہ گجراتی نے بعض زمینداروں کی مدد
سے قلعہ جونا گڈھ کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ خواجہ نظام الدین احمد سورت گئے اور
انھوں نے مظفر شاہ گجراتی کو شکست دی۔ یہ واقعہ آخر رجب ۹۹۳ھ کا ہے۔

۹۹۸ھ میں گجرات کی حکومت مرزا عزیز کوکلتاش مخاطب بہ اعظم خاں کو
ملی اور خانخاناں کو جونپور اور شہاب الدین کو مالوہ ملا۔ محرم کی بیسویں تاریخ ۹۹۸ھ
کو اکبر بادشاہ کابل سے روانہ ہو کر لاہور پہونچا اور خواجہ نظام الدین احمد کو بادشاہ
نے اپنے پاس بلا لیا۔ ۲۴ جمادی الاخری ۹۹۸ھ کو لاہور میں جشن نوروز منعقد ہوا۔
نوروز کے تیسرے دن خواجہ نظام الدین احمد ستر سواروں کی ایک جمعیت کے
ساتھ یلغار کرتے ہوئے لاہور پہونچے۔ انھوں نے چھ سو کوس کا راستہ صرف
بارہ دن میں طے کیا۔[2]

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ گجرات میں نظام الدین احمد نے بڑے
بڑے کارنامے انجام دیے۔

خواجہ نظام الدین احمد کا قیام گجرات میں کم و بیش آٹھ سال رہا۔ اسی زمانہ میں

۱؎ طبقات اکبری ج ۲۔ ۲؎ ایضاً۔

انھوں نے طبقات اکبری تالیف فرمائی جو ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی۔ خواجہ نظام الدین احمد باحوصلہ امیر تھے۔ اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک۔ علم دوست اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اکبری دور کی بے دینی والحاد سے متنفر تھے بلکہ اس بے دینی کے خلاف ایک کتاب لکھنے کے لیے چند یادداشتیں جمع کیں لیکن کتاب نہ لکھ سکے۔ انہیں یادداشتوں کی بنیاد پر ملا عبدالقادر بدایونی نے نجات الرشید لکھی۔ اس کتاب کے چند عنوان ملاحظہ ہوں۔

اصرار بر معصیت۔ شرب خمر۔ افترا بر خدا۔ ترک صلوٰۃ۔ ترک زکوٰۃ۔ اہانت انبیاء۔ اہانت ملائکہ۔ دروغ بر رسول۔ بت پرستی۔ آفتاب پرستی۔ تعظیم کواکب۔ غلو در علم فلاسفہ کردن۔ الحاد۔ سب صحابہ۔ سجدہ بغیر اللہ۔ معنی قرآن بے علم گفتن۔ تراشیدن ریش۔ نکاح متعہ کردن۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان مسائل و موضوعات کو تفصیل سے لکھا ہے۔

متعدد لوگوں سے مرزا نظام الدین کے بہت اچھے اور گہرے تعلقات تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے بے حد خلوص و محبت کے تعلقات تھے۔ ابتدائی زمانہ میں شیخ محدثؒ فتح پور سیکری میں ان کے پاس ٹھہرتے تھے پھر جب وہ ایک جذبہ کے ماتحت یک لخت بیت اللہ کی طرف چل کھڑے ہوئے تھے تو مرزا صاحب ہی نے ان کے لیے زادراہ کا انتظام کیا تھا اور نہایت خاطر مدارات سے ان کو احمد آباد میں اپنے میاں سال بھر ٹھہرایا تھا۔[1] ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ بمطابق ۲۸ اکتوبر ۱۵۹۴ء کو ۴۵ سال کی عمر میں خواجہ صاحب نے اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو انکے غم میں پُرنم نہ ہوئی ہو۔

---

[1] حیات شیخ عبدالحق۔

شیخ وجیہ الدین علوی

علامہ وجیہ الدین بن نصراللہ بن عمادالدین علوی اپنے زمانہ کے کبار علماء و مشائخ میں تھے۔ علوم دینی میں غیر معمولی تبحر رکھتے تھے کثرت تصانیف اور تدریس میں ان کا کوئی معاصر ان کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ۲۲ محرم الحرام ۹۱۰ھ کو چانپانیر (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ شیخ وجیہ الدین کے دادا سید بہاؤالدین کی عرب سے ہندوستان سلطان محمود ثانی کے عہد حکومت میں تشریف لائے تھے اور چانپانیر کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ یہیں نکاح کیا اور یہیں انتقال ہوا۔ علامہ کی پیدائش بھی یہیں کی ہے۔

علامہ وجیہ الدین نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا سید شمس الدین سے حاصل کی۔ پانچ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا اور سات سال کی عمر میں حفظ مکمل کر لیا۔ پھر اپنے ماموں سید ابوالقاسم سے حدیث پڑھی۔ پندرہ سال کی عمر میں علامہ محمد قلی سے حدیث کی تکمیل کی۔ آخر میں محدث ابوالبرکات بنبانی عباسی سے استفادہ کیا۔ علوم عقلیہ مولانا عمادالدین طارمی سے حاصل کیے۔[1]

احمد آباد میں آمد سلطان مظفر آپ کے والد شاہ نصراللہ کی بڑی عزت کرتے تھے امور سلطنت میں اکثر ان سے مشورہ لیتے تھے۔ مظفر شاہ نے شاہ نصراللہ سے درخواست کی کہ احمد آباد میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ وہ چانپانیر سے منتقل ہو کر احمد آباد تشریف لے آئے۔ علامہ وجیہ الدین بھی اپنے والد کے ہمراہ احمد آباد آگئے اور زندگی بھر یہیں مقیم رہے احمد آباد آمد کے وقت علامہ کی عمر آٹھ سال تھی۔

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات۔

انھوں نے قرآن و حدیث اور علوم نقلیہ و عقلیہ سے فراغت کے بعد احمد آباد میں ۲۰ سال کی عمر سے تدریس شروع کی اور سرسٹھ سال تک احمد آباد میں علوم کے دریا بہاتے رہے۔

شرح جامی اور تفسیر بیضاوی جیسی تقریباً ۲۳ کتابوں کے شروح و حواشی لکھے۔ ان کی زندگی میں احمد آباد سے لاہور تک ان کے شاگردوں نے علم دین کو پھیلایا۔[1]

شیوخ سے تعلق انھوں نے متعدد بزرگوں سے فیض پایا۔ اولاً اپنے والد سے چشتیہ اور مغربیہ سلسلہ کی تعلیم پائی پھر قاضی خاں چشتی المشہور بہ قاضی قاضن کی صحبت میں رہ کر علوم باطنی حاصل کرتے رہے۔ ان کے بعد میاں بدرالدین ابوالقاسم سہروردی سے تعلق قائم کیا۔ جب جذبۂ شوق کا غلبہ ہوتا تو سید کبیرالدین مجذوب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آخر میں سید محمد غوث گوالیاری شطاری کے دامن تربیت سے وابستہ ہوگئے۔

شیخ غوث محمد گوالیاری کے خلاف شیخ علی متقی نے کفر کا فتوی دیا تھا جس کا ذکر شیخ گوالیاری کے حالات میں تفصیل سے ملتا ہے۔ فتوی کی بنیاد شیخ گوالیاری کی کتابوں کی بعض قابل اعتراض باتیں تھیں۔ علامہ وجیہ الدین علوی نے فتوی دیکھا تو فتوی کو پھاڑ دیا۔ شیخ علی متقی کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت ناراض ہوئے۔ اور علامہ وجیہ الدین سے کہا کہ بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ پیدا کرنے میں تم کس طرح راضی ہوگئے؟ علامہ وجیہ الدین نے جن کا قلب و جگر پہلے ہی

[1] تاریخ صوفیائے گجرات۔

شیخ گوالیاری کے دام الفت میں گرفتار ہو چکا تھا جواب دیا کہ ہم ارباب قال ہیں۔ شیخ گوالیاری اہل حال ہیں۔ ہمارا فہم ان کے کمالات تک نہیں پہنچ سکتا۔

اوصاف و کمالات علامہ وجیہ الدین بڑے صاحب صدق و اخلاص تھے۔ قناعت اور سخاوت کے پیکر تھے۔ جو کچھ حاصل ہوتا طلبہ پر صرف کر دیتے اپنے دولتکدہ اور مسجد میں عبادت و تدریس کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔

مدرسہ کا قیام ۹۳۴ھ میں انھوں نے خانپور احمد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام مدرسہ عالیہ علویہ رکھا۔ ۸۴ سال کی عمر تک اس مدرسہ میں درس دیتے رہے۔ آپ کی طبیعت پر طریقت اور باطنی شغل کا اس قدر غلبہ ہوا کہ کبر سنی میں درس و تدریس بھی موقوف فرما دی اور ہمہ تن طریقت ہی کے ہو کر رہ گئے، اسی اثنا میں ایک رات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "مدرسہ میں درس دینا نہ چھوڑو"۔ اس ارشاد عالی پر دوبارہ درس دینا شروع کر دیا اور تادم آخر یہ خدمت انجام دیتے رہے مذکورہ خواب کے بعد مدرسہ کا نام تبدیل کر کے مدرسہ درس محمدی رکھ دیا۔[1]

مدرسہ درس محمدی کے ہونہار فضلاء میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں حضرت غوث گوالیاری کے چاروں صاحبزادے اور شیخ محمد بن فضل اللہ اور علامہ صبغۃ اللہ بھروچی اور شیخ اسحاق بھروچی اور سید جلال الدین شاہ عالم۔

زہد و قناعت آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ موٹا کپڑا پہنتے تھے اور عام لوگوں کی طرح رہتے جو کچھ آتا دوسروں پر خرچ کر دیتے امیروں کے گھر پر خود کبھی نہ جاتے۔

[1] تاریخ صوفیائے گجرات۔

ایک دفعہ حکام وقت کی طلب پر مجبوراً جانا پڑا ورنہ گھر اور مسجد کے احاطہ سے باہر قدم نہ رکھتے۔

کرامات ان کی کرامات میں سے ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک روز خواجہ عبدالشہید کے ایک مرید نے وجیہ الحق کی خدمت میں یہ ماجرا بیان کیا کہ فقیر اپنے وطن میں ایک سخت مرض میں بتلا ہو گیا یہاں تک کہ لوگوں کو صحت سے مایوسی ہو گئی اس کے بعد میں پیر کے آستانہ پر جا پڑا اس خیال سے کہ اس جگہ موجود ہونا بشرط حیات یقیناً جلد صحت یابی کا سبب ہوگا۔ ایک روز پیر نے مراقبہ کے لیے زانو پر سر رکھا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ایک نورانی شخص ایسے لباسوں میں جو ہمارے ملک میں غیر متعارف ہے حجرہ میں آئے۔ کچھ دیر کے بعد پیر نے فقیر کو بھی حجرہ کے اندر بلا لیا۔ آنے والے نورانی شخص نے پانی پر دم کر کے بیمار کے لیے شربت شفا کر دیا۔ پیتے ہی فوراً مجھ کو آثار صحت اپنے جسم میں معلوم ہونے لگے۔ اسی وقت وہ خضر رفتار مسیحا حجرہ سے نکلے اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے میں نے پیر سے دریافت کیا کہ ان بزرگ کا نام کیا ہے ان کا مقام کہاں ہے۔ فرمایا نام شیخ وجیہ الدین احمد ہے اور مسکن احمد آباد گجرات ہے۔ اسم الٰہی کے مظہر اس زمانے میں آپ ہی ہیں۔ جب میری نظر تمہاری دشوار بیماری پر پڑی تو ناامیدی کا اثر دل میں محسوس ہوا۔ علاج کے لیے میں نے ان سے امداد چاہی۔ جب پیر کی زبانی یہ قصہ سنا تو اس ملک کے سفر کی اجازت لے کر روانہ ہوا طلب ارادت صادق تھی کہ اس کی برکت سے قدم بوسی کی سعادت کو پہونچ گیا۔ الحمد للہ میں نے پا لیا جو کچھ چاہتا تھا۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ شیخ وجیہ الدین شیخ گوالیاری کے

خلیفہ ضرور تھے مگر ایسے خلیفہ تھے کہ مرشد کو بھی ان پر فخر تھا۔ "مرشد بخلافت او مباہات کند" شیخ وجیہ الدین کثیر التصانیف بزرگ تھے ان کی مندرجۂ ذیل تصانیف خاص طور پر مشہور رہیں:۔

۱۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی
۲۔ حاشیہ تلویح
۳۔ حاشیہ کشف الاصول بزدوی
۴۔ حاشیہ علی المواقف
۵۔ حاشیہ ھدایہ
۶۔ حاشیہ شرح تجرید
۷۔ حاشیہ شرح مقاصد
۸۔ حاشیہ شرح عقائد
۹۔ حاشیہ شرح نخبۃ فکر
۱۰۔ حاشیہ علی شرح الوقایہ
۱۱۔ حاشیہ عضدیہ
۱۲۔ حاشیہ شرح جامی
۱۳۔ حاشیہ مطول
۱۴۔ حاشیہ مختصر
۱۵۔ حاشیہ شرح چغمنی
۱۶۔ حاشیہ قطبی
۱۷۔ حاشیہ شرح ملا
۱۸۔ شرح ارشاد النحو
۱۹۔ حاشیہ مختصر المعانی
۲۰۔ وافیہ شرح کافیہ

اس کے علاوہ بھی دیگر شروح و حواشی ہیں۔

شیخ کی وفات ۹۹۸ھ میں ہوئی۔ ان کا مزار احمد آباد میں ہے جو زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

"بفات نامۂ حیات النبیؐ" اور اسکی املائی خصوصیات

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

وفات نامۂ حیات النبیؐ، دکھنی کی ایک قدیم مثنوی ہے جس کو عالم مسکیں نامی ایک شاعر نے ۱۰۸۷ھ میں قلم بند کیا ہے، یہ عالم مسکیں کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا اس کا پتہ نہ خود مثنوی سے چلتا ہے، نا ہی تذکروں میں اس کے کچھ حالات ملتے ہیں، مثنوی میں جگہ جگہ اس نے صرف اپنا تخلص استعمال کیا ہے، وہ بھی کہیں عالم مسکیں ہے تو کہیں صرف عالم یا صرف مسکیں؛ ابتدا کے پانچ اشعار میں اس نے خدا کی حمد و ثنا اور رسول خدا کی منقبت بیان کی ہے اور پھر اپنے اصل موضوع پر آگیا ہے، خاتمہ میں بھی صرف چند دعائیہ شعر ہیں، چنانچہ لکھا ہے:

یا رسول اللہ طم پر سلام   عالم مسکیں بھیجے مدام
اس مسکیں کو طم دلاسا دیود   ھر دو عالم کی خبر طم لییو
پناہ پکڑے ہے طماھرے دوار   طماھری شفاعت کا امید دار
قاضی عالم ھوئیے طم   عالم اوپر کرو رحم

اور آخری دو شعر میں سنہ تصنیف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

ہزار برس اوپر اشی اور سات   ہجری تھے طم عالم ھات
بفات نامہ حیات النبیؐ   لیج کر کیتا تمام سبھی

موضوع | جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شاعر نے اس مثنوی میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو آپ کی وفات کے وقت پیش آئے تھے، شاعر نے بی بی عائشہؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ صفر کا مہینہ تھا، ایک رات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سو رہے تھے کہ آدھی رات کو وہ اچانک اٹھ بیٹھے اور کپڑے پہن کر باہر جانے لگے، میں نے پوچھا اتنی رات گئے آپ گھر چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں، رسول اللہؐ نے فرمایا، بس میں ابھی قبرستان سے ہو کر آتا ہوں، یہ کہہ کر انھوں نے غلام کو ساتھ لیا اور قبرستان کی طرف چل پڑے، وہاں پہنچ کر انھوں نے سب کے لیے دعا کی اور واپس آکر سو رہے۔

صبح اٹھے تو وہ بے حد اداس تھے، دوستوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے زار و قطار رونے لگے، ذرا دل ہلکا ہوا تو سب کو مخاطب کر کے فرمایا، دوستو! آدھی رات کو خدا کے حکم سے میرے سامنے ایک خزانہ پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ تم اس میں سے جو چاہو لے لو، میں نے عرض کیا اے خدا مجھے صرف تیری خوشنودی چاہیے خزانہ نہیں، پھر کہا، یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہیں اور اس دنیا سے میرا کوچ قریب ہے، خدا تمہارا حافظ و ناصر ہے، تم آپس میں مت لڑو، دین میں نت نئے جھگڑے کھڑے نہ کرو، نماز روزہ مت چھوڑو، حج زکوٰۃ سے منہ مت موڑو اور دین کی راہ پر ایسے چلو کہ سرخرو ہو کر مجھ سے ملو،

صحابۂ کرامؓ بھی رو پڑے، پھر انھوں نے رسول اللہؐ سے پوچھا، یا رسول اللہ! آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کو غسل کون دے گا، آپؐ کی تجہیز و تکفین کون کرے گا، رسول اللہؐ نے فرمایا، گھر کے لوگ، خاص طور پر علی جو اہل بیت کے ایک فرد ہیں اور

گھر کے ولی بھی' پھر فرمایا، میرے کفن کے لیے سفید کپڑا استعمال کرنا، پھر حضرت علیؓ سے
مخاطب ہو کر کہا، اے علی! نہلانے کے بعد میری آنکھوں میں جو پانی ہوگا اسے تم چوس
لینا، اس سے تمہارے علم میں اضافہ ہوگا اور پھر میری تجہیز و تکفین کے بعد مجھ پر درود
و سلام بھیجنا، میرے جنازہ میں جبرئیل، میکائیل، اسرافیل' ملک الموت' جن و انس
اور دوسرے ملائکہ بھی شریک ہوں گے اور ان کے پیچھے سارے یار مہاجرین و انصار
کا قافلہ ہوگا، مجھ پر کوئی رونا نہیں اور جو مجھ تک پہنچ نہ سکے اس کو میرا سلام پہنچا دینا، یہ
کہہ کر رسول اللہؐ گھر کے اندر تشریف لے گئے' اور تین دن تک باہر نہ نکلے۔

اس درمیان میں ایک دن ایسا آیا جس میں انہیں بی بی میمونہؓ کے ساتھ رہنا تھا
رسول اللہؐ نے بی بی عائشہؓ کے گھر رہنے کی خواہش ظاہر کی، بی بی میمونہؓ نے بخوشی اس کی
اجازت دیدی، یہاں آکر ان کی تکلیف اور بڑھ گئی اور بخار اتنا بڑھ گیا کہ پاس میں
بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس کی تپش سے بے چین ہو گئے، حضرت ابو سعیدؓ قریب بیٹھے
ہوئے تھے، انھوں نے کہا یا رسول اللہؐ! آپؐ خدا کے رسول ہیں، آپؐ پر درد و دکھ کا
اس قدر بار کیوں؟ رسول اللہؐ نے جواب دیا، صرف میرے ساتھ ہی نہیں، تمام انبیاءؑ
کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے، پھر انھوں نے بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں، بلالؓ کی اذان
سنتے ہی سارے لوگ مسجد کی طرف دوڑ پڑے اور مسجد ایسی بھری کہ تل دھرنے کی
جگہ نہ رہی، پھر رسول اللہؐ منبر پہ تشریف فرما ہوئے اور خدا کی حمد و ثنا کے بعد ایک
ایک کو مخاطب کرکے الوداع کہا، پھر فرمایا، اپنا دل دنیا سے مت باندھو' ایک دن
سب کو مر کر اندھیری کوٹھری میں جانا ہے، نیک کام کرو، خدا اور رسولؐ کے احکام پہ
عمل کرو' بدعت سے بچو، حلال روزی کھاؤ، دوسروں کا حق نہ مارو، برا کام مت کرو'

تقویٰ اور پرہیزگاری سے کام لو، میری اولاد کے ساتھ محبت سے پیش آؤ، قریش'
مہاجر اور انصار سب کو بڑا جانو، مجھ پر کسی کا کوئی قرضہ ہو تو مانگ لو اور جس کو جو
کہنا ہو بلا خوف کہو۔

ایک شخص نے کھڑے ہو کر تین درہم کا مطالبہ کیا، رسول اللہؐ نے اس کو وہ تین
درہم دلا دیے' دوسرے نے کسی اور قرض کا تقاضا کیا، رسول اللہؐ نے اس کے تقاضے
کو بھی پورا کیا، اس طرح ایک ایک کر کے رسول اللہؐ نے سب کے مطالبات پورے
کیے، یہاں تک کہ ایک صحابیؓ "عکاشہ بن محصنؓ" نے کھڑے ہو کر کہا، یا رسول اللہؐ ایک بار
آپؐ نے کسی اور کو مارنے کے لیے کوڑا اٹھایا تھا' میں پاس میں بیٹھا ہوا تھا، وہ کوڑا
مجھے لگا، مجھے بدلہ لینے کی اجازت دی جائے، سب لوگ حیرت سے ان کا منھ تکنے
لگے، مگر رسول اللہؐ کی پیشانی پر ایک بل نہ آیا، انھوں نے فوراً آدمی بھیج کر بی بی فاطمہ
کے گھر سے کوڑا منگوایا، اپنی قمیص اتاری اور صحابی سے کہا لو بدلہ لے لو، صحابی کی
آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، انھوں نے جلدی سے اٹھ کر مہر نبوت کو بوسہ دیا اور
کہا، یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان' میں نے آپؐ سے سنا تھا کہ جس
شخص کو مہر نبوت کے دیدار نصیب ہوں گے اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے'
آخر نماز کا وقت ہوا تو رسول اللہؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اور پھر
آہستہ آہستہ رسول اللہؐ کی روح پرواز کر گئی۔

ان تفصیلات کو بیان کرنے میں شاعر نے بڑی حد تک سادگی اور حقیقت پسندی
سے کام لیا ہے اور رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری لمحات کے متعلق صرف وہی باتیں
بیان کی ہیں جو عام طور پہ احادیث میں ملتی ہیں۔

اس قسم کے واقعات کو موضوع بنا کر اس پر مثنوی لکھنا قدیم شعرا کے ہاں کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ دکھنی ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بی فاطمہؓ کی وفات کے واقعات کو موضوع بنا کر بھی متعدد شعرا نے مثنویاں لکھی ہیں، چنانچہ 'وفات نامۂ بی بی فاطمہؓ'، 'وفات نامۂ فاطمۃ الزہراؓ' اور 'وفات نامۂ خاتون جنت'، وغیرہ اسی کی چند مثالیں ہیں، البتہ رسول اللہؐ کی وفات کے حالات پر ہیں زیر بحث مثنوی کے علاوہ صرف دریا کی لکھی ہوئی ایک اور مثنوی ملتی ہے جس کے متعدد نسخے آصفیہ لائبریری، کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں بھی پائے جاتے ہیں، نصیر الدین ہاشمی کی وضاحت کے مطابق دریا کی یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ میں لکھی گئی ہے اور اس میں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال قلم بند کیا ہے، آپ کی بیماری سے ابتدا کیا ہے اور دفن پر ختم کیا ہے"۔

ہاشمی کی وضاحت سے صاف ظاہر ہے کہ دریا کی مثنوی اور عالم مسکیں کی مثنوی میں موضوع کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے البتہ دونوں کا سال تصنیف الگ ہے، عالم مسکیں نے اپنی مثنوی سنہ ۱۰۸۷ھ میں لکھی ہے اور دریا نے سنہ ۱۱۱۱ھ میں، یعنی پورے چوبیس سال بعد، اس اعتبار سے عالم مسکیں کی زیر بحث مثنوی اپنے موضوع کی یقیناً پہلی مثنوی ہے اور اس کا صرف ایک قلمی نسخہ جامعہ بمبئی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

لیکن زیر بحث مثنوی کی اہمیت محض اس کے موضوع، اس کی نایابی یا اس کی قدامت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کچھ اس کی لسانی نوعیت کی وجہ سے ہے اور بہت کچھ اس کی ان املائی خصوصیات کی وجہ سے ہے جو اب تک کسی اور قدیم یا جدید مثنوی میں

دیکھنے میں نہیں آئیں۔

لسانی نوعیت یہ مثنوی بنیادی طور پر ایک دکھنی مثنوی ہے جس میں گجراتی زبان کے اثرات بھی جگہ جگہ نمایاں ہیں، لسانی اعتبار سے دکھنی اور گجری کے درمیان خط فاصل کھینچنا بہت مشکل ہے، بلوم فیلڈ نے اپنی گرانقدر کتاب لینگویج (Language) میں ان جغرافیائی، سماجی اور لسانی محرکات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو مختلف زبانوں کی ایک دوسرے سے متاثر ہونے میں مدد کرتے ہیں، یہاں ان تفصیلات سے بحث کرنے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، البتہ اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ ہر زبان وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ اور سماج کے اثرات سے متاثر ہوتی رہتی ہے اور ان اثرات کی وجہ سے اس میں صوتی، لفظی، معنوی اور ترکیبی اعتبار سے تبدیلی آتی رہتی ہے، دکھنی کا بھی تقریباً یہی حال ہے، چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے تک دکھنی زبان میں زیادہ تر مرہٹی زبان کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی پڑتے تھے مگر سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب مغلوں نے گجرات پر بھی قبضہ کر لیا اور دکن و گجرات کے بیچ کی دیوار گر گئی تو گجرات کے سماجی اور لسانی اثرات سے دکھنی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، اور اب مرہٹی کے ساتھ ساتھ گجراتی کے لسانی اثرات بھی دکھنی میں صاف طور پر دکھائی دینے لگے، زیر بحث مثنوی میں بھی جگہ جگہ مرہٹی کے ساتھ ساتھ گجراتی زبان کے اثرات نمایاں ہیں، ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) [میں] بروزن 'لیں' کے لیے گجراتی میں [ما] کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اس مثنوی میں بھی اکثر مقامات پر [ما] کا ہی استعمال ہوا ہے چنانچہ رسول اللہؐ کی تعریف میں شاعر کہتا ہے:

دین دُنی ما اُن کا سان   جن پر نازل ہوا قرآن

اسی طرح مذکورۂ بالا صحابی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

داد کا لیش، یکایک دل ما بوج   بھی اس کا دل کہے سوج

(ب) [میں] بروزن 'ہیں' کے لیے گجراتی میں [ہوں] کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس مثنوی میں بھی جگہ جگہ [ہوں] ہی استعمال ہوا ہے چنانچہ بی بی عائشہؓ رسول اللہؐ سے فرماتی ہیں:

مئی پوچا ہوں وا رہی ھا   اس بیلا طم جاتی بھی کھا

(ج) 'آگے' اور 'پیچھے' کے لیے گجراتی میں [اگل] اور [پچھل] استعمال ہوتا ہے چنانچہ یہ لفظ اس مثنوی میں بھی دکھائی دیتے ہیں مثلاً صحابۂ کرامؓ کے بارے میں شاعر نے لکھا ہے:

ان کی بیچھل سغلی یار   کل مہاجر کل انصار

(د) [کجوں] بہ معنی 'کبھی' اور [پگ] بہ معنی 'پاؤں' بھی گجراتی الاصل ہیں، جن کا اس مثنوی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

کجوں نہ پکایو مال حرام   کجوں نہ کیجو پورا کام
پگ دھرئی کو رھی نجباغ   نبی فرماوی دیکھو ماغ

(ھ) لاحقہ [وا] بھی گجراتی الاصل ہے جو امر اور بعض دوسرے افعال کے ساتھ عموماً استعمال ہوتا ہے، مثنوی کے بعض اشعار میں اس کا بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ بی بی عائشہؓ ایک جگہ رسول اللہؐ سے درخواست کرتی ہیں:

ھمو کو کچ نصیحت کروا   دین دنیا کی وصیت کروا

ایک اور جگہ ہے:

عاقبت کا کچ توشا کروا   جہاں کے آبدا نا مروا

(و) [دوار] بمعنی دروازہ کا استعمال بھی گجراتی میں زیادہ عام ہے، ایک جگہ لکھا ہے:

پناہ پکڑیں ہے طاھری دوار   طاھری شفاعت کا امیدوار

املائی خصوصیات

دکھنی پر اس طرح کے گجراتی اثرات شاید اور مثنویوں میں بھی مل جائیں مگر جو خصوصیت اس مثنوی کو دوسری دکھنی مثنویوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی املائی خصوصیت ہے، کیونکہ اب تک دکھنی یا قدیم اردو کے جو قلمی نسخے نظر سے گزرے ہیں وہ یا تو خط نسخ میں ہیں یا نستعلیق میں، کہیں کہیں خط شکستہ کے بھی کچھ نمونے مل جاتے ہیں، لیکن ان مثنویوں کے کسی ایک نسخے میں بھی کوئی ایسا خط نہیں ملتا جو زیر بحث مثنوی کی طرح خط نسخ میں تصرف کر کے بنایا گیا ہو، اس تصرف کو بحث کی سہولت کی غرض سے دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں، ایک وہ جو سادہ اور مفرد آوازوں کی تحریری علامات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا وہ جو مرکب اور خاص طور پر ہکاری آوازوں کی علامات تحریر سے تعلق رکھتا ہے۔

سادہ اور مفرد آوازوں کی تحریری علامات کے سلسلہ میں ہمیں جو تصرف اس مثنوی میں ملتا ہے وہ زیادہ تر [ب]، [ت]، [ج]، [ڈ]، [ڑ]، [س]، [گ]، اور [و] کی آوازوں سے متعلق ہے، چنانچہ اس مثنوی میں مستقل طور پر [ب] کو [پ]، [ت] کو [ط]، [ج] کو [ز]، [ڈ] کو [ڍ]، [ڑ] کو [ر]، [س] کو [ش]، [گ] کو [غ] اور [و] کو [ب] لکھا گیا ہے۔

مرکب یا ہکاری آوازوں کی علامات تحریر میں عام اردو تحریر کی طرح [ھ] کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ [ھ] کی جگہ تین نقطوں [ۃ] نے لی ہے اور مفرد آوازوں کی تحریری علامات کے نیچے تین نقطے لگا کر یہ آوازیں حاصل کی گئی ہیں، اگر کہیں [ھ] کا اضافہ کیا بھی گیا ہو تو اسکے نیچے بھی تین نقطوں کا اضافہ ضروری سمجھا گیا ہے، چنانچہ اس میں مستقل طور پر [بھ] کو [بھ]، [ٹھ] کو [ٹِ]، [چھ] کو صرف [ڇ]، [کھ] کو [کِ]، [گھ] کو [غ] یا [ڈھ] کو [ڊھ] لکھا گیا ہے، ان سارے تصرفات کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

	متن	املا
[ب]، [پ]،	کئی دن جو نا آئے بھار	کئيِ دِن جونا آءِ ي ٻهاس
	گھابرے ہوئے سارے یار	غَا ٻهرِ ي هوءِ ي سارِ ي يار
	ھنوت خوشبوئی تن لگائے	هَنوتْ خُش بُوءِ ي تَنْ لَغَاءِ ي
	کافور اور مشک پیشانی لائے	کَافُورْ اوْرْ مشکْ پيشَانِي لَاءِ ي
	عورت مرد کل ننھے بڑے	عَورَتْ مَرْ دْ کُل نَنِيّ ٻَڊِ ي
	نبی کی مسجد آن بھرے	نَبِي کِي مَسْجِدْ آن ٻَهرِ ي
[ت]، [ط]،	اے مرد توں خراب ہوا	اَي مَرْ دْ طوں خَرَابْ هُوَا
	آپ کوں اپنے رسوا کیا	آپْ کُوں اَپ نِ ي رُ شْوَا کِيَا
	سلمان فارسی تم اب جاؤ	سَلْمَان فَارْ سِي طُم اَبْ جَاءو
	بی بی کن تھے مانگ کر لاؤ	بي بي کن ٿِهي مَا غ کَرْ لَاءو
	یار تمہارے روتے ہیں	يَارْ طُما هرِ ي رُو تِي هَيْءِ
	مانگ تم سا کھوتے ہیں	مَانِغْ طُم سا ڪو تِي هَيْءِ

	متن	املا
[ج]، [ز]،	فوج در فوج ملائکہ آوے	فوزْ دَرْ فوزْ مَلَائِکَةْ آوِي
	نماز نبی پڑھ کر جائے	نمَازْ نَبِي پڙکرْ جَاءِ ي
[ڈ]، [ڊ]،	کچوں نہ کھا یو مال حرام	کَچوں نَکِا يو مَالِ حَرَامْ
	کچوں نہ کیجو بھونڈا کام	کَچوں نکيجو بُو ڊا کامْ
[ڈ]، [ر]،	پڑی شہر میں دوڑا دوڑ	پَڊِي شهرْ مَيْ دورْ ادور
	آئے سب گھر سونا چھوڑ	آءِ ي سب غهرْ سوئي چور
	جیوں لڑکے کو ماں پلائے	جِيوْلَرْ کِي کوْ مَاءْ پلاءِ ي
	چوچی اس کے منہ کو لائے	ڇوڇي اس کے منه کوں لاءِ ي
[س]، [ش]،	سانچ زباں پہ آتا نئیں	شَاچْ زبان پرْ آ تا نَهيئي
	کینا من کا جاتا نئیں	کِنيَا من کا جَاتا نَهيئي
	آپ کو اپنے رسوا کیا	آپْ کُوں اَپْنِي رُشوا کيَا
	نبی کے آگے فضیحت ہوا	نبي کے آ غِي فَضِيحَتْ هُوا
	نبی نے کھیا یا عمر	نَبِي نِي کَهيا يا عُمَرْ
	رسوائی اس کی ہے بدتر	رُشوائي اُسْ کا هي هي بَتَّر
[گ]، [غ]،	دایم قایم وہی ہے خدا	دَايِم قَايِم وُهِي هَي خُدَا
	جیوے جاگے وہی سدا	جيوي جَاغِي وُهي سدَا
	امت سب کو راہ لگائے	اُمَّتْ سَبْ عور اه لَغَاءِ ي
	اس دنیا سے آپ سدھائے	اِسْ دُنيا ٿهي آپ سدَ ٿَاي
[و]، [ب]،	اپنا وعدا وفا کرو	اپنَا وَاعَدَا بَفَا کَرو

	میرا مطلب روا دھرو	میرا مطلب رَوا ڌھر و
	پائے نبی نے آپ وفات	پاءِ نبيءَ نی آپ بفات
	کیوں چھوڑو گے دین کی بات	کیوں ڇڏو گے دین کی بات
[بھ]، [ٻھ]	فرمایا کہ کیا قبول	فرمایا کے کیا قبول
	مجھ کوں یہ بات گئی تھی بھول	مجکوں یہ بات گئي تھي ڀول
	یار مجلس میں آن بھرے	یار مجلس ما آن ڀري
	آنکھ نبی کے انجو جھڑے	آنکھ نبي کي انجو جھري
[ٹھ]، [ٺ]	باٹھ دین کی ایسے چلو	باٺ دینٔ جي ايسي چلو
	سرخرو ہو کر مجھ کوں ملو	سرخرو ہو کر مج کوں ملو
	وعظ نصیحت کھے دراز	وعظ نصيحت کري دراز
	اٹھ ظہر کی کیتے نماز	اُٺ ظهر جيتي کري نماز
[چھ]، [ڇ]	کیا چھپاؤں تم سے کچھ	کيا ڇپاؤں تم سي ڪڇ
	نزدیک ہیگا میرا کوچ	نزدیک ھيگا ميرا کوچ
	پوچھے اس سے بھی بڑھ کر	پُڇي اس سي ٻھي ٻڙھ کر
	کل میں رہوں گا کس کے گھر	کال میں رھوں گا کس کي گھر
[کھ]، [ک]	اول حق کی کروں بکھان	اوّل حق کي کروں بکان
	جن نے کل کوں دیتا جان	جن ني ڪُل کوں دیتا جان
	سبھی خزانہ لائے دکھائے	سب ھي خزانا لاءِ ڏکائي
	لے لیو جو کچھ تم کوں بھائے	لیئو جو ڪڇ تم کوں ڀاءِ

[گھ]، [ڳ]	ابوبکر تھے اپنے گھر	اُبوبکر تھي اپني ڳھر
	سن کر دوڑے گھوڑے پر	سُن کر دوڙي غودي پر
	ڈرے کر جانے اہل قریش	ٻڊي کر جاني اَهل قریش
	یہ سگلے ہیں میرے خویش	ایہ سڳلي ھي میری خیش
[ڈھ]، [ڍ]	سینہ ان کا بھر کر آئے	سینا ان کا بھر کر آئي
	ان سے قرأت پڑھی نہ جائے	اُن تھي قرات پڙھي نہ جاءِ

مذکورہ بالا مثالوں میں جہاں تک سادہ اور مفرد آوازوں کی علاماتِ تحریر میں تصرف کا تعلق ہے، وہ تصرف سے زیادہ ان آوازوں کی متقلوبی حالت معلوم ہوتی ہے، مطلب یہ کہ آوازوں کی یہ جوڑیاں چونکہ قریب المخرج ہیں اس لیے ان کا ایک دوسرے میں بدلنا ایک قدرتی بات ہے اور یہ ہر زبان میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے، چنانچہ [ب] کا [و] میں، اور [و] کا [ب] میں، [س] کا [ش] میں، اور [ش] کا [س] میں، [ج] کا [ز] میں، اور [ز] کا [ج] میں، [ی] کا [ے] میں اور [ے] کا [ی] میں بدلنا ایک عام خصوصیت ہے جو اور دکھنی مثنویوں میں بھی دکھائی دیتی ہے، مگر ہکاری آوازوں کی تحریری علامتوں میں یہ تصرف صرف اسی مثنوی سے مخصوص ہے اور کسی حد تک سندھی کی ہکاری آوازوں کی علاماتِ تحریر سے ملتا جلتا ہے کیونکہ سندھی میں بھی ہکاری آوازیں حاصل کرنے کے لیے ان کی سادہ آوازوں کی تحریری علامتوں کے نیچے یا اوپر نقطے لگا دیے جاتے ہیں بس فرق یہ ہے کہ زیرِ بحث مثنوی میں اس مقصد کے لیے تین نقطے استعمال ہوئے ہیں جب کہ سندھی میں چار نقطوں کا استعمال عام ہے جیسے [بھ] کے لیے [ٻ]، [تھ] کے لیے [ٿ]، [پھ] کے لیے

[ق] اور [چھ] کے لیے [چ] وغیرہ[۳۳]

چند دیگر خصوصیتیں | ان لسانی اور املائی خصوصیات کے علاوہ اس مثنوی میں بعض ایسی خصوصیتیں بھی ہیں جن کو کسی خاص زبان کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے، اس قسم کی چند خصوصیتیں حسب ذیل ہیں:

(الف) [ک، ک] کی املائی شکل ہر جگہ [ک] ہے چاہے وہ کسی لفظ کی ابتدا میں واقع ہوا ہو، درمیان میں یا آخر میں مثلاً:

ابتدائی حالت: کچوں نکچائیو مال حرام　　کچوں نکیچو پوڈا کام

درمیانی حالت: اس دن بیچوں ابو بکر　　نماز جماعت میں جاتی کر

اختتامی حالت: بلال نی تب دیتی بانگ　　سُنی ساری شہر کے

(ب) ضمیر متکلم 'میں' اور حرف جر 'میں' دونوں کا املا ہر جگہ 'میی' ہے یا 'میے' ہے جیسے:

مَی پُوچھا ہوں واری ہا　　اس بیلا ٹُم جاتی کہا

پن کر جاکر غم میں سوی　　اُنسی رات تھے دُکھ ہوئی

(ج) نون غنہ کا استعمال صرف لفظ کے آخر میں نظر آتا ہے، بیچ میں نہیں،

قدح پانی کے پانی بھری　　پاس اکیس کے نغاد ہری

پوچی اس تھے پھی پر کر　　کال مَنی رہوغا کس کی غم

(د) وقفہ کی حالت میں بعض مقامات پر 'ہ' کا اضافہ کر دیا ہے:

خُدا تم کوں نیکی دیہ　　خبر تما ہی وہی ہی لیہ

آپ آپ میں لپ یونا ہ　　دین ما جغی اکس یونا ہ

حاصل بحث | اس طرح زیر بحث مثنوی میں ہمیں جو املائی خصوصیات ملتی ہیں

ان میں زیادہ نمایاں نقطوں اور اعراب کا استعمال ہے، فن تحریر کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف آوازوں کی ایک جیسی علامات تحریر کو نقطوں اور اعراب کی مدد سے ممیز کرنے کا یہ طریقہ سب سے پہلے عرب نحویوں نے وضع کیا تھا، مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کی قرأت میں کوئی غلطی نہ ہو، کیونکہ خلفائے باشندین کے عہد تک عربی علامات تحریر میں نقطوں کا وجود نہ تھا، مختلف آوازوں کی ہم شکل علامات بغیر نقطوں کے ایک جیسی ہی لکھی جاتی تھی، مثلاً [ج] [ح] [خ] جیسی تین مختلف آوازوں کی علامت تحریر صرف [ح] اور [ب] [ت] [ث] جیسی تین مختلف آوازوں کی علامات تحریر صرف [ٮ] ہوا کرتی تھی، ان کی صحیح ادائیگی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی، صرف چند پڑھے لکھے عرب ہی ان آوازوں کو سیاق و سباق کی مدد سے صحیح طور پر ادا کر سکتے تھے، بعد میں جب غیر عرب قومیں بھی فوج در فوج دین اسلام میں شامل ہونے لگیں تو قرآن مجید کی صحیح قرأت کا مسئلہ اور بھی دشوار ہو گیا، چنانچہ عبد الملک بن مروان کے عہد میں ان دشواریوں کو دور کرنے کی طرف پہلی بار باقاعدہ توجہ دی گئی اور ان کے حکم سے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے عراق میں نصر بن عاصم کی سرکردگی میں نحویوں کی ایک کمیٹی مقرر کی اور عربی رسم الخط کی اصلاح کا کام اس کے سپرد کیا، اس کمیٹی نے عربی زبان کی مختلف تحریری علامتوں میں امتیاز پیدا کرنے کی غرض سے نقطوں کو رواج دیا اور پھر کچھ سال بعد عبد الرحمن خلیل بن احمد عروضی نے اعراب کی خاص شکلیں وضع کیں جیسے [ـَ] [ـِ] [ـُ] اور [ـّ] وغیرہ، اس طرح نقطوں اور اعراب کی ایجاد نے قرآن مجید کی قرأت اور اس کے املا کو بالکل ہی سائنٹفک بنا دیا۔[۳۴]

عربوں کے اثر سے بعد میں جن قوموں نے بھی اپنی زبانوں کے لیے عربی رسم الخط کو اپنایا اور اپنی اپنی زبانوں کی مخصوص آوازوں کے لیے عربی رسم الخط اور املا میں تصرف کیا ہے وہ انہی نقطوں اور اعراب کی مدد سے کیا ہے، اس تصرف کی مثالیں ہم سندھی کے علاوہ پشتو، فارسی اور اردو وغیرہ میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور آج صوتیات میں بھی مختلف آوازوں میں فرق کرنے اور انہیں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے رومن علامات تحریر کے ساتھ انہی نقطوں اور اعراب کا استعمال کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں مندرجہ بالا مثالوں میں اردو املا کا جو مخصوص روپ ملتا ہے وہ کوئی غیر شعوری روپ بھی نہیں ہے کہ آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جاسکتا ہو کیونکہ اس میں ایک خاص قسم کی یکسانیت اور تواتر پایا جاتا ہے اور کہیں کوئی جھول نہیں، اب سوال یہ ہے کہ زیر بحث مثنوی میں اردو املا کا یہ روپ خود مصنف کی دین ہے یا کاتب اور نقل کرنے والے کی؟ کاتب کی دین تو یقیناً ہو نہیں سکتی کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ قلمی نسخوں کے کاتب عام طور پر کم سواد ہوتے ہیں اور زیادہ تر مکھی پر مکھی مارنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان سے صحیح چیز کو غلط لکھنے کی توقع تو کی جاسکتی ہے مگر غلط کو صحیح لکھنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس مثنوی میں اردو املا کا یہ مخصوص روپ یقیناً خود شاعر کا اس کا اپنایا ہوا ہے اور شاعر نے اپنے زمانے اور اپنے علاقہ کے مروجہ روپ میں ہی اپنی مثنوی کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

ہمارے ایک سندھی دوست دیانند کیشوداس منشارامانی ہیں جو سندھی کے علاوہ فارسی زبان و ادب کے اچھے عالم اور محقق ہیں، وہ ۱۹۴۸ء میں ترک وطن کرکے

کراچی سے بمبئی چلے آئے تھے، یہاں وہ متعدد کالجوں میں فارسی کے استاد رہے آخر وہ بمبئی کے ایک مشہور سرکاری کالج، اسمٰعیل یوسف کالج میں کئی سال تک فارسی زبان وادب کی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے ہیں، ان کے ذاتی کتب خانہ میں ایک کتاب ہے "سندھی صورتخطی"، یہ خواجہ غلام علی الآنا کی لکھی ہوئی ہے اور سنہ ۱۹۶۵ء میں دوسری بار سندھ پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے شایع ہوئی ہے، یہ سندھی زبان میں ہے اور صرف ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے، مگر سندھی زبان کی صوتی اور لسانی نشوونما پر شاید ہی اس سے اچھی کوئی کتاب لکھی گئی ہو۔

اس میں سندھی رسم خط کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ عربی سندھی رسم خط کی بنیاد سب سے پہلے سندھ کے ایک مسلم بزرگ مخدوم ابوالحسن نے رکھی تھی، ان کا ایجاد کردہ رسم خط "ابوالحسن جي سندي" کے نام سے مشہور ہے، ان کی دعوت سے متاثر ہوکر ٹھٹھ (Tatta) کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، ان میں اکثریت بالغ اور عمر رسیدہ نومسلموں کی تھی، ان نومسلموں میں اسلامی تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے انھوں نے ضروری اسلامی احکام ان کی مادری زبان سندھی میں قلم بند کیے، مخدوم صاحب کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا، اس لیے وہ سندھی کو عربی رسم خط میں ڈھالنے اور اسے ان لوگوں میں پھیلانے میں کامیاب رہے۔

بعد میں ان سارے تصرفات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو مخدوم صاحب نے عربی علامات تحریر کو سندھی آوازوں کے مطابق بنانے کے لیے کیے۔ اس سلسلہ میں

آگے چل کر لکھا ہے کہ مخدوم صاحب نے نہ صرف سندھی کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی بنیاد رکھی بلکہ اس کو صحیح طور پر پڑھنے کے لیے اعراب کو بھی رواج دیا، آہستہ آہستہ مخدوم صاحب کا یہ عربی رسم الخط نہ صرف ٹھٹھہ میں بلکہ سندھ کے اکثر علاقوں میں سندھی زبان کی تحریر کا وسیلہ بن گیا، بہت سے عالموں نے اسلامی احکام سے متعلق نثر و نظم میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ اسی عربی رسم الخط میں ہیں۔[۵] پروفیسر منشا رامانی کا کہنا ہے کہ ویسے اب سندھی میں اعراب کا رواج نہیں رہا مگر آج بھی احتیاط پسند سندھی عالم و شاعر نہ صرف سندھی بلکہ فارسی بھی اعراب کے ساتھ لکھتے ہیں اور اس کے نمونے آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ [ک] کی جو علامت تحریر، زیر بحث مثنوی میں، ابتدائی، درمیانی اور آخری تینوں حالتوں میں [ک] کی صورت میں ملتی ہے وہ بھی سندھی زبان کی ہی ایک خصوصیت ہے۔

سنڈے ابزرور بمبئی کی اکتوبر ۱۹-۱۳/ ۱۹۹۱ کی اشاعت میں کچھ کی ایک کھاڑی 'سرکریک' (Sir Creek) پر سدھیندر کلکرنی کا ایک بہت ہی عالمانہ مضمون شایع ہوا ہے، اس میں انھوں نے ایک جگہ ریاست گجرات کے ضلع کچھ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ضلع کی ۱۱ لاکھ کی آبادی میں ۲۰ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور خاص طور پر ہند و پاک سرحد سے لگے ہوئے سو سے زیادہ گاؤں ایسے ہیں کہ جہاں کی آبادی ۸۰ فیصد سے زیادہ مسلمان ہے، لیکن چونکہ کچھ کا یہ علاقہ گجرات کے اور علاقوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہا اور وہاں ہندو سنتوں اور مسلم پیروں کی ملی جلی روایات کی مقبولیت کی بنا پر فرقہ وارانہ جذبات کبھی نہیں پنپے

اس لیے کچھ کے مسلمانوں میں ہندوستان دشمنی اور پاکستان دوستی کا جذبہ کبھی پایا نہ گیا۔

اس مضمون کے نیچے کلکرنی ہی کا ایک دوسرا چھوٹا سا مضمون امن اور بھائی چارہ کی درگاہ (Dargah for peace and brotherhood) کے عنوان سے درج ہے جس میں انھوں نے سرکھاڑی کے اس پار پائے جانے والے 'سانولا پیر' (Savla Peer) کے ایک مقبرہ کا ذکر کیا ہے، جہاں ہر سال ہزاروں ہندو اور مسلمان گلہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اس مضمون میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہاں پیر صاحب کی بہت سی کرامات مشہور ہیں، چنانچہ ہندوستانی جوانوں کے قول کے مطابق، مقامی باشندوں کا یہ عام عقیدہ ہے کہ پیر صاحب یہ پسند نہیں فرماتے کہ ہند و پاک کے جوان اس کھاڑی یا جزیرہ کے لیے آپس میں جنگ کریں، اس لیے اگر خدانخواستہ یہاں دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا بھی ہو جائیں تو نہ ہندوستانی فوجیں پاکستانی فوجیوں کو دیکھ پائیں گی، نہ ہی پاکستانی فوجیں ہندوستانی فوجیوں کو۔

مندرجہ بالا لسانی اور معاشرتی حقائق کی بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چونکہ سرزمین کچھ بھی سندھ کی طرح صوفیائے کرام کی تبلیغی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز رہی ہے اور کچھ اور سندھ کے مسلمانوں میں لسانی اور تہذیبی اعتبار سے بہت سی باتیں مشترک ہیں اس لیے زیر بحث مثنوی بھی یقیناً کچھ کے ہی کسی صوفی شاعر کی دین ہے۔

حوالے

۱ محمد بن ہشام: سیرۃ ابن ہشام (اردو) رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۱۵ء ۲ Leonard Bloomfield: Language, George Allen & Unwin Ltd. London, 1967، ۳ محمد اسحاق صدیقی: فن تحریر کی تاریخ، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء ۴ ایضاً ۵ خواجہ غلام علی الانا: سندھی صورتخطی، سندھ پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۶۵ء ۶ سدھیندر کلکرنی: 'Sir Creek' سنڈے ابزرور بمبئی، اکتوبر ۱۹-۱۳، ۱۹۹۱ء۔

شیخ موفق الدین عبداللطیف بغدادی اور مصر کے عجائبات

از

جناب شیخ نذیر حسین صاحب

شیخ موفق الدین عبداللطیف بغدادی چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کا وسیع النظر عالم، علوم حکمت کا ممتاز فاضل، ماہر نباتات اور مشہور طبیب تھا۔ وہ ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء میں بغداد میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بھی اپنے وقت کا ممتاز عالم تھا۔ اس کے گھر میں اہل علم جمع ہو کر علمی مسائل پر بحث و مذاکرہ کیا کرتے تھے۔

ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ عبداللطیف نے ابتدائی نوشت و خواند کے بعد قرآن مجید، فصیح (ثعلب)، مقامات حریری اور دیوان متنبی حفظ کیے۔ بعد ازاں بہت سے اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ اٹھائیس برس کی عمر میں اس نے ترکیہ، یونان، مصر اور شام کا سفر کیا۔ موصل کے زمانہ قیام میں عبداللطیف نے ایک کتاب تشریح الابدان لکھی جو طبی تعلیم کے نصاب میں مدتوں شامل رہی۔ اس کے بعد اس نے دمشق جا کر سلطان صلاح الدین ایوبی سے ملاقات کی، سلطان نے عبداللطیف کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ سلطان اس زمانے میں فرنگیوں سے مصروف جہاد تھا اور اس کا لشکر عکہ میں خیمہ زن تھا۔ یہاں عبداللطیف نے سلطان کے بھائی ملک العادل کی سوانح بھی لکھی۔ دمشق کے

زمانہ قیام میں اس کی ملاقات قاضی الفاضل، عماد الدین اصفہانی ابن شداد اور الکندی جیسے اہل علم سے ہوئی جن کے افکار و نظریات نے اس کی آئندہ زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

عبداللطیف کو شروع زندگی سے مصر دیکھنے کا بہت شوق تھا، اس نے سن رکھا تھا کہ علوم حکمت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر جانا بہت ضروری ہے، چنانچہ وہ قاضی الفاضل کا تعارفی خط لے کر قاہرہ پہنچا۔ یہاں اسے موسیٰ بن میمون اور ابوالقاسم الشارعی سے ملنے کا اعزاز حاصل ہوا جنھوں نے اسے ابن سینا کی کتابوں سے ہٹا کر قدیم حکمائے یونان، مثلاً اسکندر افرودیسی اور ثامسطیوس کی تصانیف سے روشناس کرایا۔ اس اثنا میں وہ حاجب لولو کی مسجد میں درس و تدریس میں بھی مصروف رہا۔

۵۸۸ھ/۱۱۹۴ء میں عبداللطیف نے دمشق جا کر سلطان صلاح الدین ایوبی سے دوبارہ ملاقات کی، سلطان نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جو اس کے قیام مصر تک جاری رہا۔ واپس مصر پہنچ کر وہ جامع ازہر میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گیا اس کے علاوہ وہ علم طب کے شائق طلبہ کو طب کی کتابیں بھی پڑھاتا رہا۔ ۵۹۷-۵۹۸ھ/۱۲۰۰-۱۲۰۲ء میں مصر میں خوفناک قحط پڑا، جس میں ہزاروں مصری لقمہ اجل بن گئے۔ اس قحط کی تباہ کاریوں کا مفصل بیان اس نے اپنی مشہور کتاب الافادہ والاعتبار میں کیا ہے، جس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

بعد ازاں وہ مصر سے القدس (فلسطین) چلا آیا، جہاں وہ مسجد اقصیٰ میں طلبہ کو پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد وہ دمشق اور حلب ہوتا ہوا علاء الدین داؤد کے دربار میں ارزنجان پہنچا، جب کیقباد سلجوقی نے ارزنجان فتح کر لیا تو عبداللطیف ارزروم

چلا آیا اور وہاں سے ارزنجان ہوتا ہوا ملطیہ کے راستے حلب کو لوٹ آیا۔ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ عبداللطیف دمشق میں مستقل طور پر آباد ہونا چاہتا تھا کہ اسے حج کا خیال آیا۔ وہ براستہ بغداد حجاز جانا چاہتا تھا، لیکن بغداد پہنچ کر وہ اچانک بیمار پڑ گیا اور ۱۲ محرم ۶۲۹ھ/ ۸ نومبر ۱۲۳۱ء کو انتقال کر گیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہوا۔

موفق الدین عبداللطیف کثیر التصانیف مصنف تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کی چھوٹی اور بڑی کتابوں کی تعداد ۱۶۵ لکھی ہے، یہ کتابیں زیادہ تر لغت، حدیث، طب، ریاضیات، نباتات اور علوم حکمت سے متعلق ہیں۔ ان میں بیشتر کتابیں دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں۔ حوادث زمانہ سے جو کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ذیل فصیح ثعلب۔ امام ثعلب کوفی نے عربی زبان کے عام فہم اور فصیح الفاظ کے بارے میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس کی شرحیں بہت سے علماء نے لکھی ہیں۔ عبداللطیف نے اس کا ذیل لکھا تھا جو مصر میں چھپ گیا ہے۔

(۲) المجرد فی الحدیث: کتب حدیث کے مشکل الفاظ کی تشریح پر مشتمل ہے اور اس کی بڑی کتاب تفسیر غریب الحدیث پر مبنی ہے، اس کی تکمیل ۵۹۱/ ۱۱۹۵ء میں ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ اس کے بعض رسائل جو فلسفہ، نباتات اور طب سے متعلق ہیں دمشق، بیروت اور پیرس کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

(۳) عبداللطیف کی مشہور ترین کتاب "کتاب الافادہ والاعتبار فی الامور المشاہدۃ والحوادث المعائنۃ بارض مصر" جو اس کے قیام مصر کے دلچسپ مشاہدات

حیرت انگیز محسوسات اور گہرے تجربات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب مختلف یورپی ممالک اور مصر میں کئی بار چھپ گئی ہے اور اس کا لاطینی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ شایع ہو چکا ہے۔ اس کا عمدہ ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں لندن سے شایع ہوا تھا جو مصنف کے خود نوشت نسخے پر مبنی ہے، اس میں عربی متن کے ساتھ مقابل کے صفحے پر انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے جو ایک ایرانی نژاد عراقی فاضل کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کا نام THE/EASTERN/KEY ہے۔

کتاب الافادہ والاعتبار دو حصوں اور نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین ابواب میں مصر کی نباتات، حیوانات، غذائی اجناس، درختوں، پھولوں، پھلوں اور سبزیوں اور ترکاریوں کا بیان ہے۔ مصنف نے بھنڈی، توری، کھیرے اور تربوز کا بیان بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ مصری کھجوروں کو دیکھ کر مصنف کو عراقی کھجوریں یاد آجاتی ہیں جو مصری کھجوروں سے زیادہ خوشگوار اور عمدہ ہوتی ہیں۔ عبداللطیف چونکہ خود ماہر نباتات اور فاضل طبیب ہے اور یونانی زبان سے آشنا ہے اسلیئے وہ ارسطوطالیس اور جالینوس کی کتابوں کے غلط سلط مندرجات کی تصحیح یا تردید بھی کرتا جاتا ہے۔ مصری باشندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بلغمی مزاج ہیں، اسلیئے ان کے چہرے پژمردہ اور جسم کمزور ہیں۔ یہ لوگ کاہل اور طبعاً سست ہیں۔ بیس برس کی عمر کے بعد ان کے چہرے جھکنے لگتے ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ تیز فہم اور ذہین بھی ہیں۔

کتاب الافادہ کا چوتھا باب مصر کے آثار قدیمہ کے بیان میں ہے اور کتاب کا سب سے زیادہ طویل باب ہے۔ آثار قدیمہ میں جو چیز مصنف کے لیے باعث حیرت

اور تعجب انگیز ہے وہ اہرام مصر ہیں۔ اس کی تحقیق کے مطابق اہرام کا لفظ ھرم سے
مشتق ہے جس کے معنی شیخوخت اور بڑھاپے کے ہیں۔ ان کا ذکر جالینوس نے بھی
کیا ہے۔ یہ اہرام مخروطی شکل کے مینار ہیں۔ ان کی تعمیر انسانی کاریگری اور ہنرمندی
کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی پختگی اور پائداری کا یہ عالم ہے کہ ان پر لوہے کا ہتھوڑا بھی
کچھ اثر نہیں کرسکتا۔ کئی دفعہ ان کو توڑنے اور مسمار کرنے کی کوششیں ہوئیں لیکن
یہ سب کار بے خیر ثابت ہوئیں۔ اہرام کے تھوڑے سے فاصلے پر ابوالھول کا سنگی
مجسمہ ہے، جس کا سر اوپر اور دھڑ زیرِ زمین ہے، اس کے سر کے مختلف حصوں
یعنی آنکھ، ناک اور کان کا تناسب حیرت انگیز ہے۔

عبداللطیف حنف یا منفس (MEMPHIS) جس کو مصر قدیم بھی کہتے
ہیں تفصیل سے ذکر کرتا ہے جو فراعنہ مصر کا پایۂ تخت تھا اور حضرت ابراھیمؑ
حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے زمانوں میں خوب آباد اور
بارونق تھا اور جسے بخت نصر نے یہودیوں کا تعاقب کرتے ہوئے تباہ و برباد
کر دیا تھا۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے مختلف ادوار کے بیان
میں جس شہر کا حوالہ مذکور ہے وہ یہی شہر تھا۔ عبداللطیف کی تحقیق کے مطابق
قرآنی آیات دَخَلَ الْمَدِیْنَۃَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَۃٍ مِّنْ اَھْلِھَا اور فَخَرَجَ مِنْھَا
خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ میں اسی شہر کی طرف اشارہ ہے۔ اب اس کے خرابات ایک وسیع
رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں جو دیکھنے والوں کو دعوت عبرت دیتے ہیں، فراعنہ مصر کی
حنوط شدہ لاشیں بھی عبداللطیف کے لیے قابل توجہ ہیں ان میں بعض لاشیں سوتی
چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں اور بعض کے تابوت لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے تھے۔

بتوں کے مرمریں مجسموں کی خوبصورتی، ان کی تراش خراش اور ان کے اعضاء کا
تناسب بیان میں سما نہیں سکتا۔ عبداللطیف نے جالینوس کے حوالے سے لکھا
ہے کہ لاشوں کے مومیانے کا مسالہ (المومیا) رال اور مٹی کے تیل کی طرح زمین
سے برآمد ہوتا ہے اور اس کی شناخت اور طریقہ استعمال قدیم مصریوں کو بخوبی
معلوم تھا۔ بقول عبداللطیف ان تاریخی آثار کے دیکھنے سے سیاحوں کا دل نہیں
بھرتا۔ ان کے بیان کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

کتاب الافادہ والاعتبار کا پانچواں باب مصر کی عام عمارتوں، حماموں اور
کشتیوں کے لیے وقف ہے۔ عبداللطیف نے لکھا ہے کہ مصریوں کے مکانات عام
طور پر پختہ اینٹوں اور پتھروں کے ہوتے ہیں۔ ان کی بنیادیں نہایت گہری ہوتی ہیں
یہ مکانات عموماً دو منزلہ ہوتے ہیں جن میں ہوا کے آنے جانے کے لیے روشن دان
ہوتے ہیں۔ دھوئیں کے اخراج کے لیے چمنی دان ہوتے ہیں۔ گندے پانی کے نکاس
کے لیے پختہ نالیاں بنی ہوتی ہیں۔ دیہات میں مٹی گارے یا درخت کی ٹہنیوں اور
اس کے تنے کے سہارے سادہ سے مکانات ہوتے ہیں۔ شہروں کے بازار اور
شاہراہیں نہایت فراخ اور صاف ہیں۔ مصر کی باؤلیاں بھی قابل ذکر ہیں جن کے
پانی تک پہونچنے کے لیے ڈھائی تین سو سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں مصر کے حمام
بھی بہت خوبصورت ہیں۔ ان میں گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔ حماموں
کی چھتیں خوبصورت نقش و نگار سے مزین ہیں۔ ان کے فرش پتھر کے بنے ہوئے
ہیں اور کپڑے اتارنے اور پہننے کے لیے الگ الگ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ مصر میں
کشتیاں لکڑی کے بھاری تختوں کو جوڑ کر بنائی جاتی ہیں اور دیکھنے میں جہاز

لگتی ہیں کشتی بان ان کشتیوں کو چپوؤں سے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہیں جبکہ عراق میں کشتی بان ان کو آگے کی طرف لے جاتے ہیں۔

کتاب کا چھٹا باب مصریوں کی خوراک اور ان کی غذاؤں کے بارے میں ہے۔ لوگ عام طور پر گندم یا چاول میں گوشت ڈال کر کھاتے ہیں۔ برے (بھیڑ کے بچے) کے گوشت کو مختلف ترکیبوں سے پکایا جاتا ہے اور پکانے کے بعد اس پر خوشبودار پانی چھڑکا جاتا ہے۔ مرغی کا گوشت بھی مصریوں کی مرغوب غذا ہے۔ کھانوں میں سرخ مرچ، ادرک اور سونٹھ ڈالنے کا رواج عام ہے۔ گندم سے بنی ہوئی شراب بھی عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ بعض صحرائی علاقوں میں جنگلی چوہے، مردار اور سانپ تک پکا کر کھائے جاتے ہیں۔ مصر میں قسم قسم کی مٹھائیاں بھی تیار ہوتی ہیں، جو کہ عموماً گاجر، کدو اور ادرک اور سونٹھ سے بنائی جاتی ہیں۔ ان میں بادام کے بجائے پستہ ڈالا جاتا ہے اور یہ مریضوں کے لیے مقویات کا کام دیتی ہیں۔ شلجم اور مولی کے بیجوں کو پیس کر خوردنی تیل بناتے ہیں۔ یہ تیل چراغ روشن کرنے کے علاوہ صابن بنانے کے بھی کام آتا ہے۔ صابن کی ٹکیاں مختلف صورتوں اور مختلف رنگوں کی ہوتی ہیں۔

عبداللطیف نے ایک ہندوستانی تاجر کے پاس نہایت خوبصورت اور پھول جیسی خوش رنگ چٹائیاں دیکھیں۔ یہ چٹائیاں ڈھائی ہاتھ لمبی اور کسی جوڑ کے بغیر تھیں۔ پوچھنے پر اس تاجر نے بتلایا کہ اس قسم کی چٹائیاں ہندوستانی کیلے کے پتوں کے ریشے سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ ریشے دھوپ میں رکھ کر سکھائے جاتے ہیں پھر ان ریشوں کو رنگنے کے بعد بنا جاتا ہے۔

کتاب کا نصف آخر تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں دریائے نیل کے منبع، اس کی گذرگاہ، اس کے اتار چڑھاؤ اور اسکے پانی کے خواص کا ذکر ہے۔ عبداللطیف کے خیال کے مطابق لفظ نیل عربی کے مصدر نال ینال نیلاً سے مشتق ہے، جس کے معنی عطیہ بخشش اور فیض رسانی کے ہیں۔ دریائے نیل کا ذکر قدیم یونانی مورخوں کی کتابوں میں بھی آیا ہے۔ دریائے نیل حبشہ میں ایک جھیل سے نکلتا ہے اور اسکی لمبائی تین ہزار میل کے قریب ہے۔ مصر کی زراعت اور معیشت کا دارومدار اسی دریا کے پانی پر ہے۔ راستے میں سوڈان سے پانی کے ساتھ سیاہ مٹی بھی آجاتی ہے جو کھیتوں کے لیے کھاد کا کام دیتی ہے۔ مصری اس کالی مٹی کو ابریز (خالص سونا) کہتے ہیں۔ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہت سے سانپ، بچھو، مچھر اور پسو بھی آجاتے ہیں جو بہت سی بیماریوں کا موجب ہیں۔ دریا کے اتار چڑھاؤ کی پیمائش کیلئے قبطیوں نے مختلف پیمانے اور اندازے قائم کر رکھے تھے۔ اگر کسی سال دریا میں پانی کم ہو جائے تو پانی کا رنگ نیلا پڑ جاتا ہے اور یہ قحط کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مصریوں کے خیال کے مطابق سبز پانی بہت سی ارضی و سماوی آفات کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔

کتاب کے نصف آخر کا دوسرا باب سنہ ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء کے حوادث پر مشتمل ہے۔ یورپ کے علمی حلقوں میں اس باب کے مندرجات کی بڑی شہرت رہی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس سال دریائے نیل میں بہت کم پانی آیا جس سے زمینیں سیراب اور فصلیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اس کے نتیجہ میں ملک میں خوفناک قحط پڑ گیا۔ اشیائے خوردونوش کمیاب اور گراں ہو گئیں۔ دیہاتی عوام نے بھوک سے تنگ آکر

بڑے بڑے شہروں میں ڈیرے ڈال دیے۔ فاقہ کشی سے مجبور ہو کر بہت سے
لوگوں نے شام، المغرب، حجاز اور یمن میں پناہ لی جہاں غلے کی ارزانی تھی۔ اس
افراتفری میں بہت سے بچے اپنے والدین سے بچھڑ گئے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے
لیے لوگ گوبر، لید اور کتے تک کھا گئے۔ جب یہ چیزیں بھی نایاب ہو گئیں تو
عوام مردم خوری پر اتر آئے۔ ان حالات میں غنڈوں، بدمعاشوں، چوروں اور
اچکوں اور رہزنوں کی بن آئی۔ مستورات پر دست درازی ہونے لگی۔ بچے
اور عورتیں بڑی تعداد میں اغوا ہونے لگیں کیونکہ ان کا گوشت نرم اور لذیذ
سمجھا جاتا تھا اور آسانی سے بھون کر کھا لیا جاتا تھا۔

بعض مقامات پر طبیب (حکیم) کو مریض دیکھنے کے بہانے بلایا گیا لیکن اسے
قتل کر کے اس کا گوشت بھون کر کھا لیا گیا۔ کشتی ران اپنے ساتھیوں کی مدد سے
مسافروں کو پکڑ کر اور قتل کر کے ان کا گوشت پکا کر کھا گئے، دیہات اور قصبات
بلکہ قاہرہ کے کئی محلے زندوں سے خالی ہو گئے، گلیوں اور بازاروں میں لاشوں
کے انبار لگ گئے۔ ان کو دفن کرنے کے لیے کوئی زندہ نہ رہا۔ راہ چلتے ہوئے
پاؤں مردوں پر پڑتا تھا۔ لونڈی اور غلام نہایت ارزاں قیمت پر بکنے لگے۔ بہت
سے اشراف نے مجبور ہو کر اپنے بچے علیحدہ کر دیے غرضیکہ ملک میں حشر کا سماں تھا
لوگوں کی آہ وزاری سے دل دہلا جاتا تھا۔

مصائب کے ان ایام میں تجارت پیشہ حضرات عوام کے دکھوں اور مصیبتوں
سے بے نیاز ہو کر اپنے مذموم کاروبار میں حسب معمول مصروف رہے۔ گراں فروشوں،
ذخیرہ اندوزوں اور جرائم پیشہ افراد نے خوب ہاتھ رنگے۔ جب املاک کے اصلی

مالک معدوم اور ان کے جائز وارث بھی مر گئے تو ان کے دور کے
رشتہ دار چھوڑی ہوئی جائدادوں پر قابض ہو گئے اور راتوں رات
امیر کبیر بن گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصری معاشرہ انسانی ہمدردی،
رحم دلی اور خدا خوفی کے جذبات سے محروم ہو گیا تھا اور لوگ خونخوار درندے
بن گئے تھے۔

آخری اور تیسرا باب ۵۹۸ھ/۱۲۰۱-۱۲۰۳ء کے حالات کے بیان
میں ہے۔ اس سال مردم خوری کے واقعات شاذ و نادر ہوئے۔ اشیائے
صرف کی قیمتیں بھی گر گئیں کیونکہ خریدار بہت کم رہ گئے تھے۔ کثرت اموات
کے باعث نان بائیوں، خوردہ فروشوں، موچیوں، درزیوں اور عام
دستکاروں کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ قاہرہ کے نواحی اضلاع میں میلوں
تک کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ ان کے باشندوں کی لاشیں چیلوں اور
گدھوں کی خوراک بن گئیں۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق قحط کی تباہ
کاریوں سے ایک لاکھ سے زائد انسان لقمۂ اجل ہوئے۔ دور دراز مقامات
اور دور افتادہ دیہات میں مرنے والوں کی صحیح تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ
ہی کو ہے۔

قحط کے بعد خدائی عذاب طاعون کی صورت میں نازل ہوا۔ طاعون کی وبا
سے الفیوم، الغربیہ، دمیاط اور اسکندریہ کے اضلاع سب سے زیادہ متاثر
ہوئے۔ اسکندریہ میں ایک امام مسجد نے بروز جمعہ سات سو افراد کی نماز جنازہ
پڑھائی۔ یہ وبا بوائی کے موسم میں پھیلی تھی، اس لیے کھیت مزدوروں کی شدید

قلت پیدا ہوگئی، ہل چلانے، بیج ڈالنے اور فصل کاٹنے والے یکے بعد دیگرے مرتے رہے۔ طاعون کی وبا ذرا کم ہوئی تو زلزلے آنے لگے۔ مصر کے علاوہ زلزلوں سے شام، فلسطین اور قبرص میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا، بہت سی بلند وبالا عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ صرف بیت المقدس اس خوفناک زلزلے سے کسی قدر محفوظ رہا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ فرنگی علاقوں میں مال وجان کا بھاری نقصان ہوا۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے مصری معاشرے اور مصری تمدن کی ہو بہو تصویر ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کے آخری دو بابوں میں جس باریک بینی، گہری قوت مشاہدہ اور جزئیات نگاری اور زبان وبیان پر قدرت کا جو اعلیٰ مظاہرہ کیا ہے وہ ہر طرح سے قابل ستایش ہے۔ اس کا اسلوب بیان زیادہ تر سادہ، صاف اور سلیس ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر کتاب الافادۃ والاعتبار عربی ادب میں خصوصی امتیاز رکھتی ہے۔

مقالات شبلی جلد دوم

یہ مولانا شبلی نعمانی کے حسب ذیل ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۱) عربی زبان (۲) فن بلاغت (۳) نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ (۴) شعر العرب (۵) عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ (۶) سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر (۷) املا اور صحت الفاظ (۸) اردو ہندی (۹) بھاشا زبان اور مسلمان (۱۰) تحفۃ الہند (ہندی صنائع بدائع) یہ سب مضامین مولانا کی ادارت میں شایع ہونے والے بلندپایہ اور محققانہ رسالہ "الندوہ" میں پہلی مرتبہ چھپے تھے پھر دارالمصنفین نے ان کا مجموعہ شایع کیا جس کے درجنوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، آج بھی ان مضامین کی تروتازگی اور ادبی رعنائی میں فرق نہیں آیا ہے۔

"منیجر" قیمت ۱۳ روپیے

سوئے حرم

از ضیاء الدین اصلاحی

حج ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار اور اسلام کا چوتھا بنیادی رکن ہے، اس فریضہ کی ادائیگی اور خانۂ کعبہ کی زیارت وطواف کا بے پایاں شوق ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے لیکن اس کے لیے وسعت شرط ہے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً۔ اس بناپر ابھی اس کی ادائیگی کا کوئی تصور میں نہیں کرسکتا تھا، لیکن خدا کی قدرت وکارسازی سے کچھ بھی بعید نہیں ہے، اس نے تمام موانع ومشکلات دفعتاً ختم کردیے اور غیب سے ایسے اسباب ووسائل پیدا کردیے جن کا وہم وگمان بھی مجھ عاجز وناتواں بندہ کو نہیں تھا۔

۱۶ مئی کو ایک تقریب میں شرکت کے لیے گیا تھا، شام کو واپس آیا تو گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اور کچھ آنے والے تھے، بیوی بچے، بچیاں ان کی ضیافت کے انتظام میں لگیں تھیں، میں نے پوچھا کوئی خط آیا ہو تو دے دو، اہلیہ نے کہا خوشخبری ہے، حج کی دعوت آئی ہے، پہلے سے چونکہ اس طرح کی کوئی بات نہیں تھی اس لیے یہ "خوش خبری" میرے لیے ناقابل فہم تھی، اسی اثنا میں مغرب کی اذان ہونے لگی اور میں مسجد چلا گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنی بچیوں شاہین وناہید سے اس خبر کی تصدیق کرنی چاہی تو انھوں نے میرے منجھلے لڑکے محمد طارق سے یہ تار لے کر

دکھایا جو ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی نے بھیجا تھا۔

"مسلم انٹلکچول فورم کی تجویز پر رابطہ عالم اسلامی نے آپ کو حج کے لیے مدعو کیا ہے ویزا اور ٹکٹ کے لیے فوراً سعودی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیجیے اور اپنی منظوری اور روانگی کی تاریخ سے مجھ کو بھی مطلع کیجیے۔"

یہ اطلاع واقعی مژدہ جانفزا اور خوش خبری تھی ع برین مژدہ گر جاں فشانم رواست میرے پاسپورٹ کی میعاد ۹۰ء ہی میں ختم ہو گئی تھی اس لیے اور مشکلات سے قطع نظر سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ اتنی جلدی پاسپورٹ کیسے بنے گا، ہمارے رفیق کار مولوی حافظ عمیر الصدیق دریابادی نے صبح لکھنؤ فون کیے اور طے پایا کہ پاسپورٹ کے لیے مجھے فوراً لکھنؤ جانا چاہیے چنانچہ ۱۸ مئی کو میں علی الصباح ڈاکٹر یونس نگرامی کی قیام گاہ پر پہنچا، انھوں نے مقبول احمد صاحب فاران ٹراولس سے فوراً ملنے کے لیے کہا، چنانچہ میں ان کی خدمت میں جناب افتخار حسین قدوائی منصرم دارالعلوم ندوۃ العلما کو لیکر حاضر ہوا، مقبول صاحب مجھے لے کر اپنے آفس امین آباد تشریف لائے اور نہایت شوق، دلچسپی اور توجہ و دلسوزی سے دن بھر میرے کام میں لگے رہے، جب رات کے آٹھ بجے تو انھوں نے فرمایا کہ اب آپ جائیے، ۲۳ مئی کو انشاء اللہ پاسپورٹ ملے گا۔ میں ۹ بجے دارالعلوم ندوۃ العلما پہنچا جہاں طارق میاں بھی میری مدد کو آنے والے تھے لیکن دوسرے روز صبح ہم دونوں اعظم گڈھ چلے آئے، کیونکہ کام ہو گیا تھا۔

۲۳ مئی تک کئی ضروری کام کر لینے تھے اس لیے اور بعض دوسری مصلحتوں کی وجہ سے میں نے چاہا کہ لوگوں کو میرے پروگرام کی اطلاع نہ ہونے پائے ورنہ ملنے جلنے ہی میں سارا وقت صرف ہو جائے گا، لیکن متعدد کام دوسروں کی امداد کے

بغیر انجام ہی نہیں پا سکتے تھے، اس سلسلہ میں دارالمصنفین کے لوگوں کے علاوہ جناب مقبول احمد صاحب ایڈوکیٹ ہر موقع پر پیش پیش رہتے، ایک اہم اور ضروری کام ٹیکہ لگانے کا تھا جو ڈاکٹر عبدالحلیم (صدر اسپتال) کے ذریعہ آسانی سے لگ گیا اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

میری یہ خواہش ضرور تھی کہ اپنے گاؤں کے چھوٹے بڑے ہر ہر شخص خصوصاً اپنے قریبی عزیزوں سے ایک دن مل آؤں لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے اس کی گنجائش نہیں نکلی البتہ اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے اسکوٹر سے مجھے گاؤں پہنچا کر اپنے والد بزرگوار الحاج شیخ عبدالرحمٰن صاحب اور بھائیوں اور مسجد کے مصلیوں وغیرہ سے ملا دیا۔

ڈاکٹر محمد یونس نگرامی اور جناب مقبول احمد صاحب دونوں کا اصرار تھا کہ پاسپورٹ لے کر جلد از جلد دلی جا کر ویزا لگوا لینا چاہیے چنانچہ ۲۳ مئی کو شب میں اپنی بیوی، بچوں اور دارالمصنفین کے رفقا اور کارکنوں سے رخصت ہو کر اور اپنے بڑے لڑکے محمد عامر کو لے کر ۲۴ مئی کو صبح سویرے لکھنؤ گیا اور مقبول احمد صاحب سے پاسپورٹ لے کر اپنے بڑے بھائی مولوی قمر الدین صاحب اصلاحی (قمر اعظمی) سے ملنے کے لیے کانپور روانہ ہوا، انھی کے یہاں رات گزار کر ۲۵ مئی کو گومتی سے عام سلمہ کے ساتھ دہلی آیا۔

میرے ایک عزیز افتخار احمد صاحب ریلوے میں ملازم ہیں، وہ پہلے مالویہ نگر میں رہتے تھے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اب وہ اوکھلا کے قریب رہتے ہیں، اس لیے میں نے اپنے ایک بے تکلف دوست آفاق احمد صدیقی شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یہاں جانے کا ارادہ کیا، انھوں نے اوکھلا کے قریب غفار منزل میں ایک خوبصورت

اور کشادہ مکان بنایا ہے، وہاں پہنچا تو دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے اور جب یہ معلوم ہوا کہ میں حج کے ارادہ سے آیا ہوں تو دونوں کا التفات دوچند ہوگیا۔ بعد میں جب ہم اپنے عزیز افتخار احمد صاحب کے گھر جانے لگے تو ان دونوں کو بہت گراں گزرا۔

۲۶ مئی کو سعودی سفارت خانہ اور سعودی ایرلائن جانا تھا، آفاق صاحب نے عامر کو ان کے راستے اچھی طرح بتا اور سمجھا دیے تھے اس لیے پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی، سفارت خانہ جانے سے پہلے ہم لوگ ڈاکٹر محمود الحسن ندوی کے مکان گئے، جو سفارت خانہ میں کام کرتے اور غفار منزل کے قریب ابوالفضل انکلیو میں رہتے ہیں، لیکن وہ دفتر جا چکے تھے، سفارت خانہ میں مجیدی صاحب نے کاغذ دیکھنے کے بعد میرا کام جناب طارق فلاحی کے ذمہ کر دیا تھا، انھوں نے بڑے شوق سے سارے کام انجام دے کر پاسپورٹ پر ویزا لگوا دیا۔ انھی سے ڈاکٹر محمود الحسن ندوی کو خبر کرائی تو وہ فوراً تشریف لائے اور رات کے کھانے پر اپنے گھر بلایا، میں نے کہا اگر موقع ملا تو آؤں گا، لیکن شام کو ہماری واپسی بہت دیر میں ہوئی اور ہم لوگ بہت تھک گئے تھے اس لیے ندوی صاحب کے گھر نہیں جا سکے، بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے کھانے میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ سفارت خانہ ہی میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علمائے ہند سے بھی ملاقات ہوئی وہ بھی حج کے لیے ویزا لینے آئے تھے۔ سعودی ایرلائن سے ٹکٹ حاصل کرنے میں بھی زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔

ویزا اور ٹکٹ مل جانے کے بعد اور یہ معلوم کر کے یک گونہ اطمینان ہوگیا کہ ہمارا جہاز ۳۰ مئی کو ۱۰ بجے شب میں جائے گا، لیکن یہ میرا کسی بیرونی ملک اور ہوائی جہاز کا پہلا سفر تھا اس لیے گھبراہٹ اور پریشانی فطری تھی جس کے ازالے کے لیے واقف اور تجربہ کار لوگوں کے پاس جاتا اور ان کے مشوروں اور تجربوں سے فائدہ اٹھاتا۔ جناب آفاق احمد

صدیقی خود کئی ملکوں کا سفر کر چکے تھے اور وہ برابر اپنے تجربات سے نوازتے رہتے تھے، ان کے علاوہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور مولانا عبدالوہاب خلجی ناظم مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ دہلی حج کمیٹی کے دفتر بھی اسی سلسلہ میں جانا ہوا، حج کمیٹی خواہ کہیں کی ہو، وہ حجاج کی سہولت و راحت ہی کے لیے ہوتی ہے، لیکن کاش وہ اپنے اس اصلی کام کو واقعی ہمدردی اور دل سوزی سے انجام دیتی۔ حکومت ہند ہر سال اپنے وفود بھی اسی لیے بھیجتی ہے جس کے ارکان اس کی اپنی پسند و مصلحت کے افراد ہوتے ہیں، اس سال اسی زمرہ میں مجلس مشاورت کے سکریٹری مولانا احمد علی قاسمی بھی شامل تھے جن سے حرم شریف میں اچانک ملاقات ہوگئی تھی۔

دہلی میں بھی میری کوشش یہی تھی کہ لوگوں کو خبر نہ ہو مگر میں جہاں قیام پذیر تھا وہاں اور اس کے قرب و جوار میں میرے بعض قریبی اعزہ رہتے تھے جن سے نہ ملتا تو انکو بڑی شکایت ہوتی، اس طرح ان لوگوں کے یہاں آتے جاتے کئی اشخاص سے ملاقات ہوگئی، ڈاکٹر شعیب اعظمی صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر ضیاء الحسن ندوی صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ تو میری قیام گاہ پر ملاقات کے لیے تشریف لائے مگر میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ ایک روز ذاکر نگر میں مغرب بعد اپنے ایک قریبی عزیز کا مکان ڈھونڈھ رہا تھا کہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی واک کرتے ہوئے مل گئے، انہیں کی مدد سے ہم لوگ اپنے عزیز کے مکان کو پا سکے، دوسرے روز انھوں نے بڑے اصرار سے اپنے دولتکدہ پر ہم لوگوں کو کھانے کے لیے مدعو کیا، میں نے ان سے زیادہ تر خود اپنی ہی زحمت کی بنا پر بہت عذر کیا مگر وہ اپنی خاص محبت و شفقت اور مخلصانہ لگاؤ کی بنا پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کا دستر خوان سجا کر ہی رہے۔

دہلی میں جامعہ نگر کے علاقے میں جو چند روز گزرے اس میں ہر جگہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مسئلہ ہی پر لوگ گفتگو اور اظہار خیال کرتے ہوئے ملے جوان دنوں ایک خاص مسئلہ کی وجہ سے بند تھی، دیواروں پر اسی کے متعلق پوسٹر بھی آویزاں دکھائی دیتے تھے اور اخباروں میں اسی کے بارے میں مراسلے بھی چھپتے تھے، لیکن مجھے جو مہم درپیش تھی اس کی وجہ سے اس کی طرف زیادہ توجہ کرنے کا موقع نہ ملا۔ گو مسئلہ کی نزاکت کا احساس اور اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سعودی سفارت خانے میں جناب طارق فلاحی نے ہدایت کی تھی کہ آٹھ بجے رات میں روانہ ہونے والے ہوائی جہاز پر سوار ہونے کے لیے مجھے چار بجے ہی اندرا گاندھی ایرپورٹ پر پہنچ جانا ضروری ہے، چنانچہ میں محمد عامر اور ان کے خالہ زاد بھائی نیر اعظم کے ہمراہ وقت سے وہاں پہنچ گیا، خیال تھا کہ میرے دوسرے رفقائے سفر پروفیسر مسعود الرحمان خاں ندوی صدر شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز علی گڑھ، جناب حسین امین (نمایندہ قومی آواز) اور خورشید کامل قدوائی (چیف بیورو نیوز ایجنسی) بھی پہنچ گئے ہوں گے، لیکن یہ تینوں الگ الگ اور میرے بہت بعد پہنچے۔

لوگوں نے بتایا تھا کہ حج بیت اللہ کو جانے والوں سے ایرپورٹ ٹیکس نہیں لیا جاتا لیکن مجھ سے سب سے پہلے اسی کا مطالبہ کیا گیا میں نے کہا اولاً تو میں حج کو جا رہا ہوں ثانیاً رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر جا رہا ہوں، مجھ سے کہا گیا جیسے اور جس لیے بھی جا رہے ہوں تین سو روپے دیجئے اور اگر نہ لائے ہوں تو جا کر لائیے، خیر میں نے ان کا مطالبہ ادا کر دیا ورنہ اگر اس کے لیے ٹیکسی کر کے اپنی قیام گاہ جاتا تو ہزار روپے سے کم خرچ نہ ہوتا۔

میں پان کا عادی تھا لوگوں نے کہا کہ اس کے اجزا جہاز میں نہیں لے جا سکوں گا، اس لیے میں نے پان اور اس کے سامان کی ساری چیزیں دہلی ہی میں چھوڑ دیں، میرا سامان مختصر تھا اور اس میں کوئی قابل اعتراض چیز نہ تھی لیکن میں اپنے ساتھ اپنی بعض کتابیں معارف کے چند شمارے دار المصنفین کی مطبوعات کی فہرست اور اس کے تعارف کی کچھ کاپیوں کا ایک پیکٹ لے جا رہا تھا اور یہ میرے ہاتھ ہی میں تھا، اسے لیکر ہوائی جہاز پر چڑھنے لگا تو ایک نوجوان جو عرب معلوم ہو رہا تھا اس نے پوچھا اس میں کیا ہے، میں نے اس کو عربی میں بتایا کہ اس میں کتابیں اور رسالے ہیں، میرا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک بڑے ادارہ سے ہے اور میں رابطہ کی دعوت پر حج کو جا رہا ہوں اس کے جنرل سکریٹری شیخ عبداللہ عمر نصیف اور دوسرے معزز اہل علم کو یہ کتابیں ہدیتاً پیش کروں گا۔ نوجوان نے پیکٹ کھولنا چاہا جس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے اردو میں کہا ہم لوگ اس کو چیک کریں گے آپ جہاز میں تشریف رکھیں یہ بنڈل آپ کو جدہ میں آپ کے سامان کے ساتھ مل جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے سامان کا نمبر بھی نوٹ کر لیا، اس نے یہ باتیں اس قدر وثوق سے کہیں کہ مجھ جیسے ناواقف کو یقین ہو گیا اور میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر اس سے اپنے پیکٹ کی کوئی رسید نہیں لے سکا۔

یہ پیکیٹ آتے جاتے کہیں مجھ کو نہیں ملا، جب اس کے بارے میں کسی سے گفتگو کی تو اس نے کہا کہ رسید نہیں ہے اس لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ عبداللہ عمر نصیف صاحب سے ملاقات کے وقت برسبیل تذکرہ اس کا بھی ذکر آگیا تو انکو

بھی افسوس ہوا مگر انھوں نے فرمایا کہ یہ سب ناگزیر قانونی کارروائی ہے۔

غالباً ۹ ½ بجے ہمارا جہاز دہلی سے جدہ کے لیے روانہ ہوا، جہاز میں خدمت کیلئے چند لڑکیاں اور دو تین مرد تھے، انھوں نے پہلے ٹھنڈا پانی، پھر چائے اور کافی اور سب سے آخر میں کھانا پیش کیا۔ وقفہ وقفہ سے جہاز کے متعلق مفید ہدایات عربی، انگریزی اور اردو میں دی جاتی رہیں، جہاز چھوٹتے وقت یہ قرآنی دعا بھی پڑھی گئی۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا
هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ
وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ٥
(زخرف : ۱۳ و ۱۴)

پاک ہے وہ ذات جس نے اس (سواری) کو ہماری خدمت میں لگا دیا اور ہم تو اس کو قابو میں کر لینے والے نہیں تھے، اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض ماثور دعاؤں کی تلقین بھی کی گئی۔

عموماً لوگ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اونگھنے لگے، لیکن میری آنکھ کبھی نہیں جھپکی، پہلے میں نے عشا کی نماز فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے مطابق ادا کی پھر کچھ دعائیں تلبیہ، حج اور حضرت ابراہیمؑ سے متعلق جو آیات یاد تھیں ان کو پڑھا اور یہ دعائے ابراہیمی میرے غور و فکر کا محور بن گئی:-

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے انھوں نے دعا کی کہ اے ہمارے خداوند ہماری جانب سے یہ دعا قبول کر بیشک

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً
لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
عَلَيْنَا، اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥
(بقرہ : ۱۲۷ - ۱۲۹)

تو سننے والا جاننے والا ہے اے ہمارے خداوند ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا! اور ہماری اولاد میں سے تو ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما! بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے اے ہمارے خداوند تو ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیج! جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بیشک تو غالب و حکمت والا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد کا ذکر ہے، بلاشبہ آپ کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ کے فیضان سے کفر و باطل کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، شیرازۂ یہودیت و نصرانیت بکھر گیا، سرزمین عرب شیاطین و طواغیت کے وجود سے پاک ہو گئی، اور ایسا مزکّٰی و مجلّٰی گروہ پیدا ہوا جس نے توحید کا غلغلہ بلند کیا اور صحرائے حجاز کے چپہ چپہ پر طغرائے حق کندہ کر دیا۔

کیا امیوں نے جہاں میں اجالا ہوا جس سے اسلام کا بول بالا

لیکن شہنشاہ کونین کی تعلیم و تزکیہ کا اثر امت پر باقی نہیں رہا تو آج وہ پسپا ہوگئی ہے اور کفر و طاغوت کے علمبرداروں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔

ہم ریاض سے ہوتے ہوئے جدہ پہنچے تو مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہمیں ہمارا سامان ملا، جس کی ایک ایک چیز کسٹم والوں نے دیکھی۔ غرض پوری رات اسی ادھیڑ بن میں گزری اور صبح ہوئی تو رابطہ کے نمائندے ملے، وہ ہمیں قریب میں اپنے آفس لوا گئے، فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم کو منیٰ رابطہ عالم اسلامی کے مہمان خانہ میں لایا گیا اور دفتری کارروائی مکمل ہو جانے کے بعد ہمیں ہمارے کمروں میں پہنچا دیا گیا، جدہ میں ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد ہی پارلیمنٹ کے ممبر جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ سے ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہی ہمارے رئیس الوفد ہیں، اس کے بعد سے برابر ہم لوگوں پر انکی عنایتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمارے کمرہ میں پروفیسر مسعود الرحمٰن، حسین امین اور خورشید کامل کے علاوہ کشمیر کے مولوی معین الدین ڈار بھی تھے جن کا ساتھ دہلی ایرپورٹ ہی سے ہوگیا تھا، اس کمرہ میں بنگلہ دیش کے مولانا محی الدین خاں صاحب پہلے سے فروکش تھے، ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی آئی تھیں لیکن وہ اپنے صاحبزادے کے ساتھ مقیم تھیں جو مکہ میں زیر تعلیم ہیں، مولانا محی الدین ناشتہ کے بعد وہیں چلے جاتے اور رات میں واپس آتے تھے، وہ رابطہ عالم اسلامی کے ممبر اور دار المصنفین اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب مرحوم سے بخوبی واقف تھے اس لیے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے اور اکثر پان سے میری تواضع کرتے، میں نے خود پان کا اہتمام چھوڑ دیا تھا لیکن جب کوئی پیش کرتا تو قبول کرنے میں تکلف نہ کرتا، خورشید کامل قند دانی صاحب پان پیراگ کھلا کر پان کی کمی پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

(باقی)

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۲۴ جون ۱۹۹۳ء

مکرمی و معظمی جناب اصلاحی صاحب! السلام علیکم

مزاج گرامی۔ مولوی عمیر الصدیق صاحب کے ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوا تھا کہ آپ حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ امید ہے کہ اب بخیر و عافیت واپس آگئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپکے حج کو قبول اور مبرور فرمائے۔

معارف (مئی) کے شذرات میں آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کی دینی و اخلاقی زبوں حالی اور ان کی معاشی بدحالی اور تعلیمی پسماندگی کا جس دردناک پیرایے میں ذکر کیا ہے، اس کا حال پڑھ کر افسوس ہی نہیں بلکہ رنج بھی ہوا۔

وہ صوبہ جس میں علی گڑھ یونیورسٹی کے علاوہ ہر بڑے شہر میں چھوٹے موٹے اسلامیہ کالج ہوں، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے علاوہ سینکڑوں دینی مدارس ہوں۔ جہاں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے ایثار پیشہ اور مخلص کارکن ہر وقت مصروف عمل ہوں وہاں کے مسلمانوں کی نئی نسل کی اپنے دین و مذہب اور تاریخ و تہذیب سے بے گانگی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

ملکی تقسیم سے قبل ہندوستان کے دینی مدارس ہمارے لیے علم و معرفت کے سرچشمے رہے ہیں۔ ان مدارس کے بوریا نشین علماء نے ہمیں یعنی مسلمانان پنجاب اور

سرحد کو دینی صلابت اور قومی غیرت و حمیت کا سبق دیا تھا، لیکن اب ان کو کیا ہو گیا ہے۔

علی گڑھ کے طلبہ کے لباس کی وضع قطع اور وہاں کے کپڑوں کی تراش خراش کی نقل ہمارے ہاں (مشرقی پنجاب) میں فیشن میں داخل رہی ہے، دہلی کی تہذیب و تمدن اور وہاں کے رہن سہن اور رسم و رواج کی تقلید قابل فخر سمجھی جاتی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎ ہے میرا نام و نشان نام و نشانِ دہلی۔

افسوس کہ اب ہر بات الٹی ہو گئی ہے۔

آپ نے اپنے ہاں کے ابنائے وطن اور ان کی تنگ دلی، تنگ نظری اور گھناؤنے تعصب کا ذکر کیا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اسی تنگ نظر ذہنیت کو ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر علمی و تحقیقی کام کے لیے صحت و عافیت کے ساتھ زندہ رکھے اور آپ کا قلم رواں دواں رہے۔ رفقائے کرام کی خدمت میں سلام پہنچے۔

فقط والسلام نیازمند

(شیخ) نذیر حسین

مکتوب شکاگو

شکاگو (امریکہ)

۱۳ مئی ۱۹۹۲ء

مکرمی و محترمی اصلاحی صاحب زاد لطفہ تحیۂ مسنونہ

میرا سابقہ مکتوب مل چکا ہوگا، مارچ، اپریل ۱۹۹۲ء کے شماروں کے بعد

اسی ہفتہ فروری ۹۲ء کا شمارہ وصول ہوا، میں نے نومبر اور دسمبر ۱۹۹۱ء کے پرچوں کے لیے گزارش کی تھی، نہ معلوم میرا وہ خط آپ کو ملا یا نہیں، مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہا۔ دوبارہ یہی عرض ہے، امید ہے کہ اولین فرصت میں اس معروضہ کی پذیرائی ہوگی۔

افغانستان کی صورت حال کے بارہ میں معارف نے بالکل سکوت اختیار کر لیا ہے، خانہ جنگی ایک المیہ ہے، کشمیر، الجزائر، یوگوسلاویہ آزمایش کے مراحل سے گزر رہے ہیں، ہر جگہ مسلمان جبر و استبداد کا ہدف بنے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نصرت نہ معلوم کب آئے گی؟ دنیا "آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے" کا مرقع ہے، مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ کے احتجاج سے فضا گونج رہی ہے، دیکھیے پردہ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔

والسلام

مخلص: سعید صدیقی

مکتوب علی گڑھ

شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۶ جولائی ۹۲ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

حج بیت اللہ سے شرف یاب ہونے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں، معارف (جولائی ۹۲ء) میں میری حقیر تالیف "کتابیات فراہی" پر آپ کا تبصرہ نظر سے گزرا، فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلانے اور بعض نئی معلومات بہم پہنچانے کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

آپ نے تبصرہ میں جن کتب و مضامین کی نشاندہی کی ہے ان میں سے بعض کی اطلاع اس خاکسار کو بھی تھی لیکن وہ فوراً دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں اور علامہ فراہی سمینار کے موقع پر کتابیات کی اشاعت کی عجلت تھی۔ اس لیے ان کا ذکر رہ گیا جس کی تلافی آیندہ اڈیشن میں انشاء اللہ کردی جائے گی۔

بلاشبہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون "مولانا حمید الدین فراہی اور علم حدیث" مشمولہ معارف (۴۹، ۲/ فروری ۴۲ء ص ۸۵-۱۰۲) طلوع اسلام (دہلی) اور البیان (امرتسر) میں شایع شدہ بعض مضامین کے جواب میں لکھا گیا تھا لیکن میں اس پر اتنا اضافہ مزید کرنا چاہوں گا کہ البیان یا طلوع اسلام نے یہ فتنہ اصلاً مولانا عبید اللہ سندھی کے اس مضمون کے بعض حصوں کی بنیاد پر کھڑا کیا تھا جو سب سے پہلے الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر (۷/۹-۱۲، رمضان المبارک - ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۲۰۵) میں "امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ بعد میں ادارۂ الفرقان نے اس مضمون کو کتابی صورت میں بھی شایع کیا۔ پھر یہی مضمون معمولی تبدیلی کے بعد سندھ ساگر اکادمی، لاہور سے کتابی صورت میں ۱۹۴۴ء میں "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" (مرتبہ محمد سرور) کے عنوان سے شایع ہوا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے اسی طویل مضمون کا خلاصہ پہلے البیان (امرتسر) اور پھر طلوع اسلام میں چھپا اور ادارہ طلوع اسلام نے اسے کتابچہ کی صورت میں بھی شایع کیا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون "نظم قرآن" اصلاً عربی میں الضیاء لکھنؤ (۳/۱۰) کے لیے لکھا گیا تھا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ایما سے اس کا اردو ترجمہ

معارف (۳۶، ۶/ دسمبر ۳۵ء ص ۴۴۳-۴۵۴) کی زینت بنا اور بعد میں یہ الاصلاح کے شمارہ (۱/۷، جولائی ۱۹۳۶ء ص ۲۰-۳۱) میں نقل ہوا، الاصلاح کے حوالہ سے یہ مضمون ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ) [۱/۵، جنوری - جون ۹۰ء، ص ۲۹-۴۹] میں شایع کیا گیا اور یہیں سے اشراق، لاہور۔ (۲/۱۲، دسمبر ۹۰ء، ص ۱۷-۲۸) میں بھی اس کی اشاعت ہوئی، اس تفصیل سے یہ مقصود ہے کہ کتابیات فراہی میں علوم القرآن اور اشراق کے حوالہ سے اس مضمون کا اندراج ہوا لیکن اسے غلطی سے مولانا فراہی کے مضامین میں شامل کردیا گیا (ص ۴۲) یہ بہت اچھا ہوا کہ اس مضمون کی جانب آپ کے توجہ دلانے سے یہ صریح غلطی گرفت میں آگئی۔

مولانا فراہی کی تفسیر سورہ ذاریات کے اردو ترجمہ پر آپ کا تبصرہ شایع شدہ (معارف ۸۲/۳ مارچ ۱۹۵۸ء ص ۲۳۷-۲۳۸) کتابیات کے ص ۶۳ پر مندرج ہے البتہ القائد الی عیون العقاید پر آپ کا تبصرہ کب چھپا ہے[1]

مولانا سید عبد الحی الحسنیؒ کی تصنیف الثقافة الاسلامیة فی الهند کا پہلا اڈیشن (دمشق ۱۹۵۸ء) میرے پیش نظر تھا لیکن اسمیں مجھے کوئی ضمیمہ نہیں ملا، آپکا تبصرہ پڑھنے کے بعد جب پھر چھان بین کی تو اس کے دوسرے اڈیشن (دمشق، ۱۹۸۳ء) میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا ضمیمہ نظر آیا جس میں مولانا فراہی کی عربی و فارسی تصانیف کا ذکر ہے۔

بعض حضرات کی جانب سے بھی مزید معلومات ملے ہیں اور خود میری تلاش بھی جاری ہے تاکہ آیندہ اڈیشن مزید بہتر ہو۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر منتخب ہونے پر ہم سب کیجانب سے مبارکباد قبول فرمائیں، جملہ رفقاء و متعلقین کی خدمت میں میرا سلام عرض کردیں۔

والسلام

[1] جون ۷۶ء "ض"

مطبوعات جدیدہ

سید محمد مرتضیٰ بلگرامی زبیدی، حیات اور علمی کارنامے از ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری ام اے، پی ایچ ڈی، تقطیع بڑی، کاغذ کتابت، طباعت، عمدہ، مجلد مع پلاسٹک کور، صفحات ۴۱۴، قیمت ۲۵۰ روپیے، پتہ: آل انڈیا میر اکادمی، مقبول لاری منزل، سٹی اسٹیشن لکھنؤ۔

علمائے متاخرین میں علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی بڑے جامع کمالات شخص تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز ہے جس میں تاج العروس ان کا شاہکار ہے یہ دراصل علامہ مجد الدین فیروزآبادی کی قاموس کی ضخیم شرح ہے۔ اردو زبان میں علامہ بلگرامی اور ان کی علمی خدمات پر مختلف اہل قلم کی نگارشات وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہی ہیں، لیکن ابھی تک مفصل کتاب موجود نہیں تھی، زیر نظر کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، یہ دراصل مصنفہ کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، اس میں علامہ بلگرامی کے سوانح اور تصنیفات بالخصوص تاج العروس کی اہمیت کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، قصبہ بلگرام کی تاریخ اور وہاں کے علماء و فضلا کا تذکرہ بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، علامہ بلگرامی کے معاصر علماء کے تذکرہ کے لیے ایک جدا باب ہے، عربی معجم نگاری کے ضمن میں لغت نویس حضرات کی فہرست دی گئی ہے جو مفید ہے متعدد خوبیوں کے باوجود کتاب میں تعبیر و بیان کی خامیاں

پائی جاتی ہیں، اقوال و خیالات کے نقل میں بھی بے احتیاطی ہوئی ہے اور بعض جگہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ توصیف میں ہے یا مذمت میں جیسے کہ "علامہ موصوف اپنی تعظیم و تکریم کرانے کے فن سے خوب واقف تھے" ص۱۲۵ اور یہ کہ "سید علامہ نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عظمت و عقیدت کا نقش گہرا کرنے اور اپنے قدردانوں کا دائرہ وسیع تر کرنے کیلئے حدیث کے ساتھ گنڈے اور تعویذ اور اوراد و وظائف کا بھی اضافہ کردیا" ص۱۲۸ "انھوں نے مہدی منتظر کا روپ بھرنے کا ارادہ کیا" ص۲۰۰ اور "موت نے انکو سہما دیا وہ سب کچھ بھول گئے حالانکہ وہ بہت بڑے عالم تھے، وہ یہ حدیث بھی بھول گئے جس کی وہ خود وکالت و روایت کیا کرتے تھے۔ الخ ص۲۰۴، یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ خیالات مصنفہ کے ہیں یا کسی اور کے، ص۱۱۹ پر مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کی عبارت نقل کی گئی، اس کے آخری جملہ "وکان ھذا الکاتب المقصد نفسہ حفظ کتاب نصاب الصبیان للفراہی فی بدء الطلب" کا ترجمہ کیا گیا کہ "لہذا اس کاتب یعنی مرتضیٰ نے بھی فراہی کی اس کتاب کو پہلے پہل یاد کیا ہوگا" یہ صریح غلطی ہے اور یہاں فراہی کی وضاحت بھی نہیں کی کہ یہ کون ہیں۔ اس کی وجہ سے بعد کی پوری عبارت گنجلک اور بے معنی ہوگئی ہے، اس قسم کی غیر واضح عبارتیں متعدد ہیں، مثلاً "یہ چیزیں ایک بے ثمر انتخابی تصوف کا زیور بن گئیں" ص۲۳۶ "ضخیم تصنیفات، مختصر رسائل اور چھوٹے چھوٹے اجزا کی تعداد ان کی بہت ساری اجازتوں کے باوجود ۱۰۰ سے زیادہ ہے" ص۱۸۴ "اسی طرح جو پہلی ہی صدی میں اسلامی حکومت کے دائرہ میں آگیا تھا" ص۲۹۹ اس جو کا ماقبل و مابعد جملہ سے ربط ظاہر نہیں ہوتا۔ حوالے بھی ناقص دیے گئے ہیں مثلاً رسالہ معارف مرتبہ سید سلیمان ندوی فروری ۱۹۲۷ء

تو ہے لیکن مضمون، مضمون نگار اور صفحہ کا ذکر نہیں ہے، کہیں کہیں تو صرف رسائل کا نام ہی حاشیہ میں دیدیا گیا ہے، عبارت کے ترجمہ میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی ہے، دیکھیے ص ۱۸۲ بعض جگہ سہو کتابت سے الفاظ چھوٹ گئے ہیں ص ۱۸۳، غلطیہائے کتابت نے کتاب کے معیار اور حسن کو داغدار کر دیا ہے موسوعی کے بجائے موصوعی ص ۲۴۳ ناشر کو ناشر، منتخبات ص ۳۴۲، "مز" ص ۲۸۴ یہ کونسی کتاب ہے؟ امام صنعانی کو الصنعائی ص ۲۸۲، صنعانی ص ۲۹ وغیرہ لکھا گیا ہے، سبحۃ المرجان کو کئی جگہ سبحۃ الرجان اور، یافعی صاحب مرآۃ الجنان کو بافعی لکھا گیا ہے، فہرست کتابیات میں بھی حرف بار کے ذیل میں بافعی ہی لکھا ہے، امام سخاوی کو سنجاوی، مفتاح السعادہ کو مفتاح العادہ، گستاولی بان کو بان، مولانا عبدالحی حسنی کو الحسینی لکھا گیا ہے، کتاب "ہندوستان عربوں کی نظر میں" کا مولف ایک جگہ ضیاء الدین احمد اصلاحی لکھا گیا تو دوسری جگہ اسی کتاب کے مولف کی حیثیت سے مولوی مسعود علی ندوی کا بھی ذکر [illegible] کتاب میں علامہ بلگرامی کے نادر نمونہ تحریر کے عکس بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

[illegible] کے لیے سیرت طیبہ کی اہمیت از پروفیسر نثار احمد فاروقی، [illegible] ت درج نہیں۔ کتابت و طباعت اچھی۔

یہ مختصر رسالہ پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کا ایک خطبہ ہے جو انھوں نے انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر [illegible] لکچرز کے سلسلہ میں [illegible] میں دیا تھا انھوں نے اسمیں حقوق نسواں نظریہ مساوات کے علاوہ سود و قمار، شراب و زنا جیسے مفاسد کی ہلاکت آفرینیوں پر سیرت طیبہ کی روشنی میں دلچسپ و البیلے انداز میں بڑی دلنشیں اور موثر گفتگو کی ہے، اس میں اسلام کے تصور عبادت اور رد رہبانیت پر بھی مختصر اظہار خیال ہے، یہ مفید رسالہ غالباً انجمن اسلام بمبئی کے پتہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ "ع۔ص"